مقامِ صحابہؓ

جس میں صحابہ کرامؓ کی عدالت، مقام اور ان پر
تنقید کی شرعی حیثیت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتئ اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : خضر اشفاق قاسمی
طبع جدید : محرم الحرام ۱۴۳۰ھ - جنوری 2009ء
مطبع : مائیکر وائیڈ ورٹائزنگ کراچی
ناشر : مکتبۂ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
فون : 021-5031566, 021-5031565
ای میل : info@quranicpublishers.com
ویب سائٹ : www.quranicpublishers.com

حرفِ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ کَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

بحمداللہ آج ہم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تازہ ترین تالیف ''مقامِ صحابہؓ'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ کتاب ایک ایسے موضوع پر لکھی گئی ہے جو ہمارے زمانے میں عرصہ سے معرکۂ بحث و جدال بنا ہوا ہے۔ اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کے علاوہ خود اہلِ سنت کے مختلف گروہوں نے اس میں افراط وتفریط اختیار کی ہوئی ہے اور مستشرقانہ تحقیق کی وبائے عام نے اس میں اور شدّت پیدا کی ہے۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر محققانہ اور ناصحانہ گفتگو کی ہے، اور مسئلے کے ایسے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن میں وہ شاید اب تک منفرد ہیں۔ اس کتاب میں آپ کو علم، عقل اور عشق کا وہ حسین امتزاج ملے گا جو اہلِ سنت کی نمایاں خصوصیت ہے، اور اُمید ہے کہ ان شاء اللہ یہ کتاب دِلوں سے شکوک وشبہات کے بہت سے کانٹے نکال دے گی، واللہ الموفق والمعین۔

احقر
محمد رفیع عثمانی
خادم طلبہ دار العلوم کراچی

فہرستِ مضامین

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَدَدَ کَلِمَاتِہٖ وَزِنَۃَ عَرْشِہٖ وَرِضٰی نَفْسِہٖ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَصَفْوَۃِ رُسُلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہِ الَّذِیْنَ ھُمْ نُجُوْمُ الْمُھْتَدیٰ بِھِمْ وَالْقُدْوَۃ وَالْاُسْوَۃ فِی مَعَانِی الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّۃِ وَھُمُ الْاَدِلَّاءُ عَلَی الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ بَعْدَ رَسُوْلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، اَمَّا بَعْدُ.

زیرِ نظر مقالے کا نام ''مقامِ صحابہ'' رکھا ہے تاکہ پہلے ہی یہ معلوم ہوجائے کہ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و مناقب کی کتاب نہیں، اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں بحمداللہ ہر زبان میں موجود ہیں اور تمام کتبِ حدیث میں اس کے ایک نہیں بہت سے ابواب موجود ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا تو مقام بہت بلند ہے، عام صلحاء و اولیائے اُمت کے فضائل و مناقب اور ان کی حکایات انسان کو راہِ راست دِکھانے اور اس میں دینی انقلاب پیدا کرنے کے لئے نسخۂ اکسیر ہیں، مگر وہ اس رسالے کا موضوع نہیں۔ اسی طرح اس عنوان سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب بھی نہیں، جس میں افراد و رِجال کے اچھے بُرے حالات درج ہوتے ہیں اور ان میں احوال کی کثرت وقلت کے تناسب سے کسی کو بزرگ صالح اور ولی کہا جاتا ہے، کسی کو فاسق و ظالم۔

کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد دُنیا کا کوئی اچھے سے اچھا انسان ایسا نہیں جس سے کوئی لغزش اور غلطی نہ ہوئی ہو، اسی طرح کوئی بُرے سے بُرا انسان ایسا بھی نہیں جس سے کوئی اچھا کام نہ ہوا۔ بس مدارِکار اس پر رہتا ہے کہ جس شخص کی زندگی

اچھے اخلاق و اعمال میں گزری ہے اس کا صدق و اِخلاص بھی اس کے عمل سے پہچانا گیا ہے، اس سے کوئی گناہ یا غلطی بھی ہوگئی تو بھی اس کو صلحائے اُمت ہی کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی عام زندگی میں دین کی حدود و قیود کا پابند، اَحکامِ شرعیہ کا تابع نہیں ہے اس سے دو چار اچھے بلکہ بہت اچھے کام بھی ہوجائیں تو بھی اس کو صلحاء و اولیاء کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا۔

فنِ تاریخ کا کام اتنا ہے کہ واقعات کو دیانت داری سے ٹھیک ٹھیک بیان کردے، اس سے نتائج کیا نکلتے ہیں اور کسی فرد یا جماعت کا دینی یا دُنیاوی مقام ان واقعات کی روشنی میں کیا ٹھہرتا ہے؟ یہ فنِ تاریخ کے موضوع سے الگ ایک چیز ہے، جس کو ''فقہ التاریخ'' تو کہہ سکتے ہیں، ''تاریخ'' نہیں۔

پھر عام دُنیا کے افراد و رِجال اور جماعتوں کے بارے میں یہ فقہ التاریخ انہیں تاریخی واقعات پر مبنی ہوتا ہے اور فنِ تاریخ کا ہر واقف و ماہر ایسے نتائج اپنی اپنی فکر و نظر کے مطابق نکال سکتا ہے۔

''مقامِ صحابہ'' میں مجھے یہ دِکھلانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس معاملے میں عام دُنیا کے افراد و رِجال کی طرح نہیں کہ ان کے مقام کا فیصلہ نری تاریخ اور اس کے بیان کردہ حالات کے تابع کیا جائے بلکہ ''صحابہ کرامؓ'' ایک ایسے مقدس گروہ کا نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام اُمت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ایک واسطہ ہے، اس واسطے کے بغیر نہ اُمت کو قرآن ہاتھ آسکتا ہے، نہ قرآن کے وہ مضامین جن کو قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر چھوڑا ہے، ''لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ''، نہ رسالت اور اس کی تعلیمات کا کسی کو اس واسطے کے بغیر علم ہوسکتا ہے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھی، آپ کی تعلیمات کو تمام دُنیا اور اپنے زن و فرزند اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے، آپ کے پیغام کو

اپنی جانیں قربان کر کے دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے والے ہیں۔ ان کی سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک جزء ہے، یہ عام دُنیا کی طرح صرف کتبِ تاریخ سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ نصوصِ قرآن و حدیث اور سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جانے پہچانے جاتے ہیں، ان کا اسلام اور شریعتِ اسلام میں ایک خاص مقام ہے۔ میں اس مقالے میں اسی مقام کو ''مقامِ صحابہ'' کے عنوان سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اس کی ضرورت و اہمیت تو بہت زمانے سے پیشِ نظر تھی مگر اس کے لکھنے کا ایسا قوی داعیہ جو دُوسرے کاموں کو مؤخر کر کے اس میں لگادے اس وقت پیدا ہوا جبکہ یہ ناکارہ اپنی عمر کی چھتّرویں منزل سے گزر رہا ہے، قویٰ جواب دے چکے ہیں، مختلف قسم کے امراض کا غیر منقطع سلسلہ ہے، علم و عمل پہلے ہی کیا تھا، اب جو کچھ تھا وہ بھی رُخصت ہو رہا ہے۔

ان حالات میں یہ داعیہ قوی ہونے کا سبب موجودہ زمانے کے کچھ حوادث ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اُمت کے گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ جو عہدِ صحابہؓ ہی میں پیدا ہوگیا تھا، صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی سے پیش آتا ہے، اور اسی بناء پر عام اُمتِ محمدیہ اس سے منقطع ہے، مگر اُمت کے عام فرقے خصوصاً جمہور اُمت جن کو اہل السنۃ والجماعۃ کے لقب سے ذکر کیا جاتا ہے، وہ سب کے سب صحابہ کرامؓ کے خاص مقام اور ادب و احترام پر متفق اور ان کی عظیم شخصیتوں کو اپنی تنقیدات کا نشانہ بنانے سے گریز کرتے رہے، اور اس کو بڑی بے ادبی سمجھتے رہے۔ مسائل میں اختلافِ صحابہؓ کے وقت دو متضاد چیزوں پر ظاہر ہے کہ عمل نہیں ہوسکتا، ان میں سے ایک کو اجتہادِ شرعی کے ساتھ اختیار کرنا اور بات ہے، وہ کسی شخصیت کو ہدفِ تنقید بنانے سے بالکل مختلف چیز ہے۔

''تحقیق'' کی وبا

لیکن اس زمانے میں یورپ سے جو اچھی بُری چیزیں اسلامی ملکوں میں درآمد کرلی گئی ہیں ان میں ہر چیز کی تحقیق وتنقید (ریسرچ) بھی ہے، تحقیق وتنقید فی نفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں، خود قرآنِ کریم نے اس کی طرف دعوت دی ہے، سورۂ فرقان میں "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کے صالح اور نیک بندوں کی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے: "وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا"، یعنی اللہ کے یہ صالح اور نیک بندے آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہروں کی طرح نہیں گر پڑتے کہ بے تحقیق جس طرح اور جو چاہیں عمل کرنے لگیں، بلکہ خوب سمجھ بوجھ کر بصیرت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

لیکن اسلام نے ہر چیز اور ہر کام کی کچھ حدود مقرّر کی ہیں، ان کے دائرے میں رہ کر جو کام کیا جائے وہ مقبول ومفید سمجھا جاتا ہے، حدود و اُصول کو توڑ کر جو کام کیا جائے وہ فساد قرار دیا جاتا ہے۔

کون سی تحقیق مستحسن ہے؟

تحقیق وتنقید میں سب سے پہلی بات تو اسلامی اُصول میں یہ پیشِ نظر رکھنی ہے کہ اپنی توانائی اور وقت اس چیز کی تحقیق پر صَرف نہ کی جائے جس کا کوئی نفع دین یا دُنیا میں متوقع نہ ہو، خالی تحقیق برائے تحقیق اسلام میں ایک عبث اور فضول عمل ہے، جس سے پرہیز کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے، خصوصاً جبکہ کوئی ایسی تحقیق وتنقید ہو جس سے دُنیا میں فتنہ اور جھگڑے پیدا ہوں۔ یہ ایسی ہی تنقید ہوگی جیسے کوئی ''لائق'' بیٹا اس کی تحقیق اور ریسرچ میں لگ جائے کہ جس باپ کا بیٹا کہلاتا ہوں کیا واقعی میں اسی کا بیٹا ہوں؟ اور اس کے لئے والدہ محترمہ کی زندگی کے گوشوں پر ریسرچ وتحقیق کا زور خرچ کرے۔ دُوسرے شخصیتوں پر جرم وتنقید

کے لئے اسلام نے کچھ عادلانہ، حکیمانہ اُصول اور حدود مقرّر کئے ہیں اور ان سے آزاد ہوکر جس کا جی چاہے، جو جی چاہے اور جس کے خلاف جی چاہے بولا یا لکھا کرے، اس کی اجازت نہیں دی۔ یہاں اس کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں، حدیث کی جرح وتعدیل کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کی گئی ہے۔

لیکن یورپ سے درآمد کی ہوئی ''ریسرچ وتحقیق'' نام ہی بے قید اور آزاد تنقید کا ہے، ادب اور احترام اور حدود کی رعایت اس میں ایک بے معنی چیز ہے۔

افسوس ہے کہ اس زمانے کے بہت سے اہلِ قلم بھی اس نئے طرزِ تنقید سے متأثر ہوگئے۔

بغیر کسی دینی یا دُنیوی ضرورت کے بڑی بڑی شخصیتوں کو آزاد جرح وتنقید کا ہدف بنالینا ایک علمی خدمت اور محقق ہونے کی علامت سمجھی جانے لگی۔

اسلافِ اُمت اور ائمۂ دین پر تو یہ مشقِ ستم بہت زمانے سے جاری تھی، اب بڑھتے بڑھتے صحابہ کرامؓ تک بھی پہنچ گئی۔ اپنے آپ کو اہل السنۃ والجماعۃ کہنے والے بہت سے اہلِ قلم نے اپنی ریسرچ وتحقیق اور علمی توانائی کا بہترین مصرف اسی کو قرار دے لیا کہ صحابہ کرامؓ کی عظیم شخصیتوں پر جرح وتنقید کی مشق کی جاوے۔

بعض حضرات نے ایک طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کی تائید وحمایت کا نام لے کر حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اور ان کی اولاد بلکہ پورے بنی ہاشم کو ہدفِ تنقید بنا ڈالا اور اس میں صحابہ کرامؓ کے ادب واحترام تو کیا اسلام کے عادلانہ اور حکیمانہ ضابطۂ تنقید کی بھی ساری حدود وقیود کو توڑ ڈالا۔ اس کے بالمقابل دُوسرے بعض حضرات نے قلم اُٹھایا تو حضرت معاویہ اور عثمانِ غنی رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں پر اسی طرح کی جرح وتنقید سے کام لیا۔

نئی تعلیم پانے والے نوجوان جو علومِ دین اور آدابِ دین سے ناواقف یورپ سے درآمد کی ہوئی نئی تہذیب کے دِل دادہ ہیں، وہ ان دونوں سے متأثر ہوئے

اور ان کے حلقوں میں صحابہ کرامؓ پر زبانِ طعن دراز ہونے لگی، اور صحابہ کرامؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمتِ مسلمہ کے درمیانی واسطہ ہیں، ان کو دُنیا کے عام سیاسی لیڈروں کی صف میں دِکھایا جانے لگا، جو اقتدار کی جنگ کرتے ہیں اور اپنے اپنے اقتدار کے لئے قوموں کو گمراہ اور تباہ کرتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ پر تبرّا کرنے والا گمراہ فرقہ تو ایک خاص فرقے کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے، عام مسلمان ان کی باتوں سے متأثر نہیں ہوتے بلکہ نفرت کرتے ہیں، مگر اب یہ فتنہ خود اہلِ سنت والجماعت کہلانے والے مسلمانوں میں پھوٹ پڑا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ خدانخواستہ اگر مسلمان، صحابہ کرامؓ ہی کے اعتماد کو کھو بیٹھے تو پھر نہ قرآن پر اعتماد رہتا ہے، نہ حدیث پر، نہ دینِ اسلام کے کسی اُصول پر، اس کا نتیجہ کھلی بے دینی کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟

یہ سبب ہوا جس نے ان حالات میں اس موضوع پر قلم اُٹھانے کے لئے مجبور کردیا، واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

غلط فہمیوں کا اصل سبب

اس دور میں جبکہ پوری دُنیا میں اسلامی شعائر کی کھلی توہین، فحاشی، عریانی، حرام خوری، قتل و غارت گری اور باہمی جنگ و جدال مسلمانوں میں طوفانی رفتار سے بڑھ رہا ہے اور دُشمنانِ اسلام کی ہر جگہ مسلمانوں پر یلغار ہے، اس وقت میں ان محققین ناقدین نے گڑے مُردے اُکھاڑنے اور سوئے ہوئے فتنے بیدار کرنے کو اسلام کی بڑی خدمت کیوں سمجھا؟ اس بحث کو چھوڑ کر میں ''مقامِ صحابہ'' میں اس چیز کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو اِن حضرات کے لئے مغالطے کا سبب بنی اور پھر ان کے عمل سے دُوسرے لوگوں کے لئے بہت سے دینی مسائل میں مغالطوں کا ذریعہ بن گئی۔

بات یہ ہے کہ ان حضرات نے حضراتِ صحابہؓ کی شخصیتوں کو بھی عام رِجالِ اُمت کی طرح صرف تاریخی روایات کے آئینے میں دیکھا اور تاریخ کی صحیح و سقیم روایات کے مجموعے سے وہ جس نتیجے پر پہنچے، وہی مقام ان مقدس شخصیتوں کے لئے تجویز کرلیا، اوران کے اعمال و افعال کو اسی دائرے میں رکھ کر پرکھا۔

قرآن و سنت کی نصوص اور اُمت کے اِجماعی عقیدے نے جو امتیاز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذات و شخصیات کو عطا کیا ہے، وہ نظر انداز کردیا گیا، وہ امتیازی خصوصیت حضراتِ صحابہؓ کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ان سب کے بارے میں ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ'' کا، اوران کا مقام جنت ہونے کا اعلان کردیا، اور جمہور اُمت نے ان کی ذات و شخصیات کو اپنی جرح و تنقید سے بالاتر قرار دیا۔ ان کے مختلف مسائل و مسالک میں سے عمل کے لئے شرعی حدودِ اجتہاد کے دائرے میں کسی

ایک کو ترجیح دے کر اختیار کر لینا اور دُوسرے کو مرجوح قرار دے کر ترک کر دینا دُوسری چیز ہے، اس سے جس کے مسلک کو مرجوح قرار دیا گیا ہے اس کی ذات اور شخصیت نہ مجروح ہوتی ہے اور نہ ایسا کرنا ان کے ادب کے خلاف ہے، کیونکہ اَحکامِ شرعیہ پر عمل فرض ہے اور اختلافِ اقوال کے وقت دو متضاد چیزوں پر عمل ناممکن ہے، شرعی فریضے کی ادائیگی کے لئے اقوالِ مختلفہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، بشرطیکہ دُوسرے کی ذات اور شخصیت کے بارے میں کوئی ادنیٰ بے ادبی یا کسرِ شان کا پہلو اختیار نہ کیا جائے۔

فنِ تاریخ کی اہمیت اور اس کا درجہ

اُوپر جو یہ لکھا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذوات و شخصیات اور ان کے مقام کا تعین صرف تاریخی روایات کی بنیاد پر کر لینا دُرست نہیں، کیونکہ یہ حضرات رسالت اور اُمت کے درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اَز رُوئے قرآن و سنت ایک خاص مقام رکھتے ہیں، تاریخی روایات کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بناء پر ان کے اس مقام کو گھٹایا بڑھایا جاسکے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ فنِ تاریخ بالکل ناقابلِ اعتبار و بیکار ہے، (آگے اسلام میں اس کی ضرورت و اہمیت واضح کی جائے گی)، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اعتبار و اعتماد کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں۔

اسلام میں اعتبار و اعتماد کا جو مقام قرآنِ کریم اور احادیثِ متواترہ کا ہے وہ عام احادیث کا نہیں، جو حدیثِ رسولؐ کا درجہ ہے وہ اقوالِ صحابہؓ کا نہیں۔ اسی طرح تاریخی روایات کے اعتماد و اعتبار کا بھی وہ درجہ نہیں ہے جو قرآن و سنت یا سندِ صحیح سے ثابت شدہ اقوالِ صحابہؓ کا ہے۔

بلکہ جس طرح نصِ قرآنی کے مقابلے میں اگر کسی غیر متواتر حدیث سے اس کے خلاف کچھ مفہوم ہوتا ہو تو اس کی تأویل واجب ہے، یا تأویل سمجھ میں نہ آئے تو

نصِ قرآنی کے مقابلے میں اس حدیث کا ترک واجب ہے۔ اسی طرح تاریخی روایات اگر کسی معاملے میں قرآن وسنت سے ثابت شدہ کسی چیز سے متصادم ہوں تو وہ بمقابلہ قرآن وسنت کے متروک یا واجب التأویل قرار دی جائے گی خواہ وہ تاریخی اعتبار سے کتنی ہی معتبر ومستند روایات ہوں۔

اعتبار و اعتماد کی یہ درجہ بندی کسی فن کی عظمت و اہمیت کو گھٹاتی نہیں، البتہ شریعت اور اس کے اَحکام کی عظمت کو بڑھاتی ہے کہ ان کے ثبوت کے لئے اعتماد و اعتبار کا نہایت اعلیٰ درجہ لازم قرار دیا گیا ہے، پھر اَحکامِ شرعیہ میں بھی تقسیم کرکے ''عقائدِ اسلامیہ'' کے ثبوت کے لئے ہر شرعی دلیل بھی کافی نہیں سمجھی جاتی جب تک قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نہ ہو، باقی اَحکامِ عملیہ کے لئے عام احادیث جو قابلِ اعتماد سند کے ساتھ منقول ہوں وہ بھی کافی ہوتی ہیں۔

فنِ تاریخ کی اسلامی اہمیت

فنِ تاریخ کی اسلامی اہمیت کے لئے تو اتنی ہی بات کافی ہے کہ تاریخ و قصص قرآنِ کریم کے علومِ خمسہ کا ایک اہم جزء ہیں، قرآنِ کریم نے ایامِ ماضیہ اور اقوامِ سابقہ کے اچھے بُرے حالات بیان کرنے کا خاص اہتمام فرمایا، البتہ قرآنِ کریم نے جس طرح تاریخ وقصص کو بیان فرمایا ہے وہ ایک انوکھا انداز ہے کہ کسی قصے کو ترتیب کے ساتھ اوّل سے آخر تک پورا بیان کرنے کے بجائے اس کے ٹکڑے کرکے مختلف مضامینِ قرآنیہ کے ساتھ لائے گئے ہیں، اور صرف ایک جگہ نہیں بلکہ بار بار اس کا اعادہ فرمایا ہے۔

اس خاص طرز سے فنِ تاریخ کی اہمیت کے ساتھ اس کے اصلی مقصود کو بھی واضح کردیا گیا ہے کہ اقوامِ سابقہ کے قصے بحیثیت قصہ کہانی کے کوئی انسانی اور اسلامی مقصد نہیں، بلکہ ان سے اصل مقصد وغرض وہ عبرتیں اور نتائج ہیں جو اُن میں غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اچھے کاموں کے اچھے نتائج دیکھ کر ان کی طرف

رغبت، اور بُرے کاموں کے بُرے نتائج معلوم کر کے ان سے نفرت، اور زمانے کے انقلابات سے حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے مضامین حاصل کرنا ان کا اہم مقصد ہے۔

قدیم زمانے سے افسانوں اور کہانیوں اور پچھلے قصوں کو محض ایک دِل بہلانے کے مشغلے کے طور پر پڑھا اور سنا جاتا تھا، اسلام نے اوّل تو تاریخ لکھنے کے خاص آداب سکھائے پھر یہ بھی بتلادیا کہ تاریخ بحیثیت تاریخ خود کوئی مقصد نہیں بلکہ اس کا مقصد عبرت ونصیحت حاصل کرنا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''الفوز الکبیر'' میں بعض عارفین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگوں نے جب تجوید وقراءۃ کے قواعد کا شغل اختیار کیا تو اس میں ایسے منہمک ہوگئے کہ ساری توجہ حروف ہی کے دُرست کرنے پر رہنے لگی، نماز میں خشوع اور تلاوتِ قرآن سے تذکّر جو اصل مقصد تھا اس کو فوت کردیا۔ اسی طرح بعض مفسرین نے جب قصص پر زور دیا اور پوری تفصیلات لکھ دیں تو ان کی کتابوں میں اصل علمِ تفسیر ان قصوں میں گم ہوگیا۔

بہرحال قرآن کے علومِ خمسہ میں سے قصص وتاریخ بھی ایک اہم علم ہے جس کی تحصیل اپنی حد کے اندر واجب اور بہت بڑی طاعت ہے، پھر ذخیرۂ حدیث اور سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کیا جائے تو وہ پورا ذخیرہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال کی تاریخ ہے اور حدیث کے راویوں میں جب غلط کار یا جھوٹی حدیثیں بنانے والے لوگ شامل ہوگئے تو پورے ذخیرۂ حدیث کے روایت کرنے والے راویوں کی تاریخ اور ان کے صحیح اور اصل حالات کا معلوم کرنا حدیث کی حفاظت کے لئے ضروری ہوگیا، حضراتِ ائمۂ حدیث نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب راویوں نے جھوٹ سے کام لیا تو ہم نے ان کے مقابلے میں تاریخ کو سامنے کردیا۔

(الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التواریخ للحافظ السخاویؒ ص:۹)

تاریخ کا یہ حصہ جس کا تعلق حدیث کے راویوں اور ان کے ثقہ وغیر ثقہ،

قوی یا ضعیف ہونے سے ہے ایک حیثیت سے حدیث ہی کا جزء سمجھا گیا ہے اور ائمہ حدیث ہی نے اس حصے کے لکھنے کا اہتمام فرمایا، اس کا نام بھی مستقل ''فنِ اسمائے رِجال'' رکھا گیا، اس کے ضروری اور واجب ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے؟ علمائے اُمت میں جس کسی نے راویوں پر جرح و تعدیل کی بحث کو غیبت میں داخل کر کے اعتراض کیا ہے، وہ صرف اس صورت سے متعلق ہے جس میں جرح و تعدیل کی حدودِ شرعیہ سے تجاوز کیا گیا ہو، بے ضرورت بے مقصد عیب چینی اور کسی کو رُسوا کرنا مقصود ہو، یا جرح و تعدیل میں اعتدال و انصاف سے کام نہ لیا گیا ہو، ورنہ رواۃِ حدیث کی ضروری اور معتدل تنقید تو ایسی چیز ہے کہ اس کے بغیر ذخیرۂ حدیث ہی کا اعتبار نہیں رہ سکتا، جبکہ کوئی نیک دِل انسان حفاظتِ حدیث کی نیت سے غلط کار یا ضعیف راویوں پر معتدل تنقید کرتا ہے تو وہ حدیثِ رسولؐ کا حق ادا کر رہا ہے۔

جرح و تعدیل کے مشہور امام یحییٰ بن سعید قطان رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ آپ خدا سے نہیں ڈرتے کہ جن لوگوں کو آپ کذّاب یا غیر ثقہ یا ضعیف کہتے ہیں وہ قیامت کے روز آپ کے خلاف مخاصمہ کریں؟ تو فرمانے لگے کہ: قیامت کے روز یہ لوگ میرے خلاف احتجاج کریں، یہ اس سے بہتر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے یہ مطالبہ فرماویں کہ میری حدیث میں جن لوگوں نے کمی بیشی کی تھی تم نے اس کی مدافعت کیوں نہیں کی؟ (سخاویؒ، رسالہ مذکورہ ص:۵۳) البتہ حضراتِ محدثینؒ نے جس طرح اس ضرورت کا احساس کیا کہ حدیث کے راویوں کی پوری چھان بین کی جائے، صادق، کاذب، ثقہ، غیر ثقہ، قوی، ضعیف کو کھول کر واضح کردیا جائے، اسی طرح اس کام کو حدودِ شرعیہ میں رکھنے کے لئے چند ضروری شرائط بھی رکھی ہیں، جن کو حافظ عبدالرحمٰن سخاوی رحمہ اللہ نے تاریخ کے موضوع پر اپنی مستقل کتاب ''الاعلان بالتوبیخ لمن ذمّ التواریخ'' میں تفصیل سے بیان کردیا ہے، جن میں سب سے پہلی شرط صحتِ نیت ہے کہ کسی راوی کا عیب ظاہر کرنا، اس کو بدنام کرنا فی نفسہٖ مقصود نہ ہو

بلکہ مقصد اس کی خیرخواہی اور حدیث کی حفاظت ہو۔ دُوسرے یہ کہ صرف اس شخص کے متعلق یہ کام کیا جائے جس کا تعلق کسی حدیث کی روایت سے یا کسی فرد یا جماعت کے نفع نقصان سے ہے اور جس کے اظہار سے اس شخص کی اصلاح یا لوگوں کا اس کے ضرر سے بچنا متوقع ہو، ورنہ فضول کسی کے عیوب کو مشغلہ بنانا کوئی دین کا کام نہیں۔

تیسرے یہ کہ اس میں بھی صرف قدرِ ضرورت پر اکتفا کرے کہ فلاں ضعیف یا غیر ثقہ ہے، یا روایت گھڑنے والا ہے، ضرورت سے زائد الفاظِ عیب سے اجتناب کیا جائے۔

اور جو کچھ کہا جائے مقدور بھر پوری تحقیق کے بعد کہا جائے۔

جرح و تعدیل کے بڑے امام ابن المدینی رحمہ اللہ سے کچھ لوگوں نے ان کے باپ کے متعلق پوچھا کہ وہ روایتِ حدیث میں کس درجے کے ہیں؟ تو فرمایا کہ: یہ بات میرے سوا کسی اور آدمی سے پوچھو، مگر ان لوگوں نے اصرار کیا کہ ہم آپ ہی کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو کچھ دیر سر جھکا کر بیٹھ گئے سوچتے رہے اس کے بعد سر اُٹھا کر فرمایا:-

هو الدين، انه ضعيف. (رسالہ سخاوی ص:٦٦)

ترجمہ:- یہ دین کی بات ہے (اس لئے کہتا ہوں کہ) وہ ضعیف ہیں۔

یہ حضرات ہیں جو دین کے ادب کے ساتھ رِجال کے ادب اور حدود کی رعایت کے جامع تھے، ان کے والد روایتِ حدیث میں ضعیف تھے، شروع میں چاہا کہ اس سوال کا جواب ان کی زبان سے نہ ہو، جب اصرار کیا گیا تو ادبِ دین کی روایت مقدّم ہوگئی، حقیقت کا اظہار کیا مگر صرف بقدرِ ضرورت لفظوں میں، ضرورت سے زائد ایک لفظ نہیں بولا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کا وہ حصہ جس کا تعلق حفاظتِ حدیث سے ہے، یعنی اس کے راویوں پر تنقید اور جرح و تعدیل اور ان کے حالات کا بیان، یہ تو ان علومِ

ضروریہ میں سے ہے جس پر حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حجتِ شرعی ہونا موقوف ہے، اس لئے اس کے واجب اور ضروری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا، اور تاریخ کا یہ خاص حصہ اپنی مخصوص اہمیت کے پیشِ نظر مؤرّخین کے نزدیک یہی ایک مستقل قسم ''اسماء الرجال'' کے نام موسوم ہوکر علیحدہ کردیا گیا ہے۔ اب کلام اس تاریخِ عام میں رہ گیا جس کو عرفِ عام میں ''تاریخ'' کہا جاتا ہے، جس میں تخلیقِ کائنات اور ہبوطِ آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے وقت تک تمام زمینی اور آسمانی واقعات، اقالیمِ عالم اور ملکوں، خطوں اور ان میں پیدا ہونے والے اچھے بُرے لوگوں کے، خصوصاً انبیاء وصلحاء اور ملوک و رُؤساء کے عام اچھے بُرے حالات، دُنیا کے انقلابات، جنگیں اور فتوحات وغیرہ کا ایک جہان ہوتا ہے، یہ تاریخی حکایات جمع کرنے اور رکھنے کا دستور تو بہت پُرانا ہے، ہر ملک، ہر خطے اور طبقے کے لوگوں میں اس طرح کی حکایات سینہ بہ سینہ بھی اور کچھ کتاب میں بھی منقول چلی آتی ہیں، لیکن عام طور پر اسلام سے پہلے یہ بغیر کسی تنقیح و تحقیق کے سنی سنائی باتوں اور افسانوں اور کہانیوں کے ایک غیر مستند مجموعے کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسلام نے دُنیا میں سب سے پہلے کسی روایت کے لئے سند و اسناد کی ضرورت اور اس کی تنقیح و تحقیق کو ضروری قرار دیا، قرآنِ کریم نے خود اس کی ہدایت کی:-

اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا.

یعنی کوئی غیر معتبر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے اقوال و افعال کو کتابوں میں منضبط کرنے والوں نے اس خاص طریق کے ایک سے زیادہ فنون بنادیئے جس سے حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت تو ہو ہی گئی، دُوسری چیزوں میں بھی نقل و روایت کے اُصول بن گئے، دُنیا کی عام تاریخیں بھی جو مسلمانوں نے لکھنا

شروع کیں ان میں بھی جہاں تک ممکن ہوا ان اُصولِ روایت کی رعایت رکھی گئی۔

اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ تو کوئی مبالغہ نہیں کہ تاریخ کو ایک معتبر مستند فن کی حیثیت دینے والے مسلمان ہی ہیں، مسلمانوں ہی نے دُنیا کو تاریخ لکھنے اور اس کی تنقیح کا سبق دیا، علمائے اُمت جنھوں نے قصص الانبیاء اور پھر روایاتِ حدیث کو بہت سی چھلنیوں میں چھان کر نہ صرف جھوٹ سچ کو الگ الگ کر دیا، بلکہ سچ اور معتبر روایات میں بھی درجات اعلیٰ و ادنیٰ قائم کر دیئے، اور حدیث سے متعلق تاریخ ''اسمائے رِجال'' کو علیحدہ کر کے مثل جزءِ حدیث بنا کر دین کی یہ اہم خدمت انجام دی۔ انہیں حضرات نے عام تاریخِ عالم ملکوں اور بادشاہوں اور زمین کے مختلف حصوں کی تاریخ و جغرافیہ لکھنے پر بھی خاص توجہ مبذول فرمائی اور بڑے بڑے ائمۂ حدیث و تفسیر اور اکابر علماء و فقہائے اُمت نے مختلف انواع و اقسام کی تاریخیں لکھیں، جن کی کچھ تفصیلات حافظ عبدالرحمٰن سخاوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاعلان بالتوبیخ لمن ذمّ التواریخ'' کے نوّے ۹۰ صفحات میں جمع فرمائی ہیں، یہ خود ایک دِلچسپ اور مفید مجموعہ اور قابلِ دید و مطالعہ ہے، مگر یہاں اس کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں۔

میرا مقصد یہاں اس کے ذکر سے صرف اتنا ہے کہ علمائے اُمت نے صرف اس حصۂ تاریخ پر بس نہیں کی جس کا تعلق حفاظت اور رِجالِ حدیث سے ہے، بلکہ عام دُنیا کی تاریخ، جغرافیہ اور ملوک و مشاہیر کے حالات اور انقلابات و حوادث کے لکھنے پر بھی ایسی ہی توجہ دی اور ہزارہا چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں اس تاریخ کا بھی ایک مقام ہے جس کے ساتھ انسان کے بہت سے دینی اور دُنیاوی فوائد وابستہ ہیں۔

حافظ سخاوی نے اپنی کتابِ مذکور کے ابتدائی چالیس صفحات میں تاریخ کے فوائد و فضائل اور ان کے متعلق علماء و حکمائے اسلام کے اقوال جمع فرمائے ہیں۔

اسلام میں فنِ تاریخ کا درجہ

فنِ تاریخ کے فضائل اور فوائد جن کو سخاوی رحمہ اللہ نے بڑی تفصیل سے علماء وحکماء کے اقوال سے ثابت کیا ہے، ان میں سب سے بڑا اور جامع فائدہ عبرت حاصل کرنا، دُنیا کے عروج ونزول اور حوادث وانقلابات سے دُنیا کی بے ثباتی کا سبق لینا، آخرت کی فکر کو سب چیزوں پر مقدّم رکھنا، اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور اس کے اِنعامات و احسانات کا اِستحضار، انبیاء اور صلحائے اُمت کے احوال سے قلب کی نورانیت، اور کفار و فجار کے انجامِ بد سے عبرت حاصل کر کے کفر ومعصیت سے پرہیز کا اہتمام، حکمائے سابقین کے تجربوں سے دین و دُنیا میں فائدہ اُٹھانا وغیرہ ہے۔ مگر فنِ تاریخ کے اتنے فوائد وفضائل اور اس کی اتنی بڑی اہمیت کے باوجود اس فن کو یہ مقام کسی نے نہیں دیا کہ شریعتِ اسلام کے عقائد و اَحکام اس فن سے حاصل کئے جائیں، حلال وحرام کے مباحث میں تاریخی روایات کو حجت قرار دیا جائے، جن مسائل کے ثبوت کے لئے قرآن وسنت اور اِجماع وقیاس کے شرعی دلائل کی ضرورت ہے، ان میں تاریخی روایات کو مؤثر مانا جائے یا تاریخی روایات کی بناء پر قرآن وسنت یا اِجماع سے ثابت شدہ مسائل میں کسی شک وشبہ کو راہ دی جائے۔

وجہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ اگرچہ زمانۂ جاہلیت کی تاریخوں کی طرح بالکل بے سند، ناقابلِ اعتبار کہانیاں نہیں ہیں بلکہ علمائے اُمت نے تاریخ میں بھی مقدور بھر اُصولِ روایت کی رعایت کر کے اسے مستند ومعتبر بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن فنِ تاریخ کے مطالعے اور اس سے اپنے مقاصد میں کام لینے کے وقت دو باتوں کو نظر انداز نہیں

کرنا چاہئے، اور جس نے ان دو باتوں کو نظر انداز کیا وہ فنِ تاریخ کو غلط استعمال کر کے بہت سے گمراہ کن مغالطوں میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

روایاتِ حدیث اور روایاتِ تاریخ میں زمین آسمان کا فرقِ عظیم

پہلی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یعنی آپ کے اقوال و اعمال کو جس صحابی نے سنا یا دیکھا ہے اس کو بحکمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی ایک امانت قرار دیا ہے جس کا اُمت کو پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً.

یعنی میری احادیث اُمت کو پہنچادو اگرچہ وہ ایک آیت ہی ہو۔

یہاں آیت سے آیتِ قرآن بھی مراد ہوسکتی ہے، مگر نسقِ کلام سے ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تبلیغ ہے، اور "وَلَوْ اٰیَۃً" سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ وہ کوئی مختصر جملہ ہی ہو، پھر حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا:۔

فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ.

یعنی حاضرین میری یہ باتیں غائبین تک پہنچادیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے بعد کسی صحابی کی کیا مجال تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ طیبات یا اپنی آنکھ سے دیکھے ہوئے اعمال و افعال کی پوری پوری حفاظت نہ کرتا اور اُمت کو پہنچانے کا اہتمام نہ کرتا۔ اس کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو والہانہ محبت تھی اس کو صرف مسلمان نہیں کفار بھی جانتے اور حیرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وضو کا مستعمل پانی بھی زمین پر نہیں گرنے

دیتے تھے اپنے چہروں اور سینوں پر ملتے تھے۔ ان کے لئے اگر حدیث کی حفاظت اور تبلیغ کے اَحکامِ مذکورہ بھی نہ آئے ہوتے تب بھی ان سے یہ کیسے تصوّر کیا جاسکتا تھا کہ یہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک سے علیحدہ ہونے والے بالوں کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرانے ملبوسات کی جان سے زیادہ حفاظت کریں اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے مستعمل پانی کو ضائع نہ ہونے دیں، وہ تعلیماتِ رسولؐ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کا اہتمام نہ کرتے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اوّل تو خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی والہانہ محبت اس کی داعی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک کلمے، ایک ایک حدیث کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کریں، اس پر مزید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَحکامِ مذکورہ جاری فرمادیئے، اس لئے ایک لاکھ سے زائد تعداد کی یہ فرشتہ صفت مقدس جماعت صرف ایک ذاتِ رسولؐ کے اقوال و افعال کی حفاظت اور اس کی تبلیغ کے لئے سرگرم عمل ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ یہ بات نہ کسی دُوسرے بڑے سے بڑے بادشاہ کو نصیب ہوسکتی ہے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور شخصیت کو کہ اس کی ہر بات کو غور سے سن کر ہمیشہ یاد رکھنے کی اور پھر لوگوں تک پہنچانے کی کسی کو فکر ہو۔ بادشاہوں کے واقعات، ملکوں اور خطوں کے حالات، زمانے کے انقلابات دِلچسپی کے ساتھ ضرور دیکھے سنے جاتے ہیں مگر کسی کو کیا پڑی ہے کہ ان کو پورا پورا یاد رکھنے کا بھی اہتمام کرے اور پہنچانے کا بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیثِ رسولؐ کو چونکہ اَحکامِ شرعیہ میں عملی قرآن کا درجہ دینا اور حجتِ شرعیہ بنانا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا، اس لئے اس کا سب سے پہلا ذریعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اس ناقابلِ قیاس محبت و اطاعت کو بنادیا، جو ظاہر ہے کہ دُنیا کی کسی دُوسری شخصیت کو حاصل نہیں، اس لئے تاریخی واقعات و روایات کو کسی حال وہ

درجہ حاصل نہیں ہوسکتا جو روایاتِ حدیث کو حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ قرآن اور تعلیماتِ رسالت کو دُنیا کے گوشے گوشے تک اور آنے والی نسلوں تک پہنچائیں، اس کا ایک قدرتی انتظام تو صحابہ کرامؓ کی والہانہ محبت کے ذریعے ہوگیا، دُوسرا قانونی انتظام نہایت حکیمانہ اُصول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ ایک طرف تو ہر صحابی پر فرض کردیا کہ جو کچھ دین کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں یا عمل کرتے دیکھیں وہ اُمت کو پہنچائیں، دُوسری طرف اس خطرے کا بھی سدِ باب کیا جو کسی قانون کے عام اور شائع کرنے میں عادۃً پیش آتا ہے کہ نقل در نقل میں بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور اصل حقیقت غائب ہوجاتی ہے، اس کا انتظام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد سے فرمایا:-

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

یعنی جو شخص جان بوجھ کر میری طرف کوئی غلط بات منسوب کرے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس وعیدِ شدید نے صحابہ کرامؓ اور مابعد کے علمائے حدیث کو نقلِ روایت میں ایسا محتاط بنادیا کہ جب تک نہایت کڑی تنقید و تحقیق کے ساتھ کسی حدیث کا ثبوت نہ ملے اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے سے گریز کیا۔ بعد میں آنے والے وہ حضراتِ محدثینؒ جنھوں نے حدیث کی ابواب و فصول کی صورت میں تدوین و تصنیف کا کام کیا ان سب حضرات نے اپنی لکھی ہوئی اور یاد کی ہوئی لاکھوں حدیثوں میں سے ایسی کڑی تنقید و تحقیق کے ساتھ صرف چند ہزار حدیثوں کو اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی، ''تدریب الراوی'' ص:۱۲ میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:-

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیرصحیح حفظ یاد ہیں، انہیں سے صحیح بخاری کا انتخاب کیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں کل غیرمکرّر

احادیث چار ہزار ہیں۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: میں نے تین لاکھ احادیث میں سے انتخاب کرکے اپنی کتاب صحیح لکھی ہے، اس میں بھی صرف چار ہزار احادیث غیر مکرر ہیں۔

ابوداوٗد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ احادیث لکھی ہیں جن میں سے انتخاب کرکے سنن مرتب کی ہے، جس میں چار ہزار احادیث ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: میں نے مسندِ احمد کی احادیث کو سات لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے انتخاب کیا ہے۔

اس طرح قدرتی اسباب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیمانہ انتظام کے سایہ میں، احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایاتِ حدیث، ایک خاص شان احتیاط کے ساتھ جمع ہوکر کتابُ اللہ کے بعد دُوسرے درجے کی حجتِ شرعی بن گئی۔

لیکن دُنیا کی عام تاریخ کو نہ یہ مقام حاصل ہوسکتا تھا، نہ ہے

کیونکہ اوّل تو لوگوں کو عام وقائع اور حوادث کو یاد رکھنے پھر ان کو لوگوں تک پہنچانے کا اتنا اہتمام کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

دُوسرے کتبِ تاریخ کی تصنیف کرنے والے اگر تاریخی روایات کو اس معیار پر جانچتے جس پر روایاتِ حدیث کو جانچا تولا ہے اور اتنی ہی کڑی تنقید و تحقیق کے ساتھ کوئی تاریخی روایت درجِ کتاب کرتے تو ذخیرۂ حدیث میں اگر چار لاکھ تین چار ہزار کا انتخاب ہوا تھا تو تاریخی روایات میں وہ چار سو بھی نہ رہتی، اس طرح ننانوے فیصد تاریخی روایات نسیاً منسیاً ہوجاتیں اور بہت سے دینی دُنیوی فوائد جو ان روایات سے متعلق تھے وہ مفقود ہوجاتے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمۂ حدیث جن کی کتابیں حدیث میں اُصولِ معتمد علیہ کا

درجہ رکھتی ہیں، ان میں وہ جن راویوں کو ضعیف قرار دے کر ان کی روایت چھوڑ دیتے ہیں، جب وہ تاریخ کے میدان میں آتے ہیں تو ان ضعیف راویوں کی روایات بھی شاملِ کتاب کر لیتے ہیں، واقدیؔ اور سیفؔ بن عمر وغیرہ کو ائمۂ حدیث نے حدیث کے معاملے میں ضعیف بلکہ اس سے بھی زیادہ مجروح کہا ہے مگر تاریخی معاملات مغازی و سیر میں وہی ائمۂ حدیث ان کی روایات نقل کرنے میں کوئی رُکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔

حدیث اور تاریخ کے اس فرق کو ان حضرات نے بھی اپنی کتابوں میں تسلیم کیا ہے جنھوں نے تاریخی روایات کے بھروسے صحابہ کرامؓ کا مقام متعین کرنے اور ان کی شخصیتوں پر الزامات لگانے کا غلط راستہ اختیار کیا ہے، اس لئے اس فرق پر مزید بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ عام دُنیا کی تاریخ اور اس میں مدوّن کی ہوئی کتابیں فنِ حدیث، فقہ یا عقائد کی طرح شریعتِ اسلام کے عقائد و اُحکام سے بحث کرنے والا کوئی فن نہیں ہے، جس کے لئے روایات کی تنقیح و تنقید کی سخت ضرورت ہو اور کھرے کھوٹے کو ممتاز کئے بغیر مقصد حاصل نہ ہو۔ اس لئے فنِ تاریخ میں ہر طرح کی قوی و ضعیف اور صحیح و سقیم روایتیں بغیر نقد و تبصرہ کے جمع کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ علومِ قرآن و سنت کے ماہر وہی علماء جو تنقید و تحقیق اور جرح و تعدیل کے امام مانے گئے ہیں، جب فنِ تاریخ پر کوئی تصنیف لکھتے ہیں تو اگرچہ زمانۂ جاہلیت کی تاریخوں کی طرح بے سروپا افواہوں اور افسانوں کو اپنی کتاب میں جگہ نہیں دیتے بلکہ اُصولِ روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے سند کے ساتھ روایت نقل کرتے ہیں، اسی لئے اسلامی تاریخیں تاریخی حیثیت میں عام دُنیا کی تاریخوں سے صدق و اعتماد کے اعتبار سے ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں، لیکن تاریخ میں وہ راویوں کے حالات کی چھان بین اور اس جرح و تعدیل سے کام نہیں لیتے جو فنِ حدیث وغیرہ میں استعمال کی جاتی ہے، جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا کہ اگر فنِ تاریخ میں اس طرح کی چھان بین کی جاتی تو

ننانوے فیصد تاریخ دُنیا سے گم ہوجاتی اور جو فوائدِ عبرت و حکمتْ اور تجاربِ عالم کے اس فن سے وابستہ ہیں ان سے دُنیا محروم ہوجاتی۔ دُوسرے جبکہ عقائد و اَحکامِ شرعیہ کے مقاصد اس سے وابستہ نہیں تو اس احتیاط و تنقید کی ضرورت بھی نہیں تھی، اس لئے حدیث اور جرح و تعدیل کے ائمہ نے بھی فنِ تاریخ میں توسع سے کام لیا، ضعیف و قوی اور ثقہ و غیرثقہ ہر طرح کے لوگوں کی روایتیں اس میں جمع کردیں، خود ان حضرات کی تصریحات اس پر شاہد ہیں۔

حدیث و اُصولِ حدیث کے مشہور امام ابنِ صلاح رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "علوم الحدیث" میں فرمایا:-

وغالب على الأخباريين الاكثار والتخليط فيما يروونه.

(علوم الحدیث ص:۲۶۳)

ترجمہ:- مؤرّخین میں یہ بات غالب ہے کہ روایاتِ کثیرہ جمع کرتے ہیں جن میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات خلط ملط ہوتی ہیں۔

"تدریب الراوی" ص:۲۹۵ میں سیوطی رحمہ اللہ نے بھی بعینہٖ یہی بات لکھی ہے، اسی طرح "فتح المغیث" وغیرہ میں بھی یہی بات نقل کی گئی ہے۔

ابنِ کثیر رحمہ اللہ جو حدیث و تفسیر کے مشہور امام اور بڑے ناقد معروف ہیں، روایات میں تنقید و تحقیق ان کا خاص امتیازی وصف ہے، مگر جب یہی بزرگ تاریخ پر کتاب "البداية والنهاية" لکھتے ہیں تو تنقید کا وہ درجہ باقی نہیں رہتا۔ خود "البداية والنهاية" جلد:۸ صفحہ:۲۰۲ میں بعض تاریخی روایات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: اس کی صحت میرے نزدیک مشتبہ ہے، مگر مجھ سے پہلے ابنِ جریر رحمہ اللہ وغیرہ یہ روایت نقل کرتے آئے ہیں، اس لئے میں نے بھی نقل کردیا، اگر وہ ذکر نہ کرتے تو میں اِن کو اپنی کتاب میں نہ لاتا۔

ظاہر ہے کہ کسی حدیث کی تحقیق میں وہ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس کی صحت مشتبہ ہونے کے باوجود چونکہ پہلے کسی بزرگ نے لکھا ہے، اس لئے لکھتا ہوں۔ یہ تاریخ ہی کا اپنا مقام تھا کہ اس میں ابنِ کثیرؒ نے اس توسع کو جائز قرار دیا۔

اور یہ اس کے باوجود ہے کہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایۃ'' میں بہت سے مقامات پر طبریؒ کی روایت پر تنقید کرکے رَدّ بھی کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں اس کی شہادت ہیں کہ فنِ تاریخ میں ان حضراتِ ناقدین نے بھی یہی مناسب سمجھا ہے کہ کسی واقعے کے متعلق جتنی روایات ملتی ہیں سب کو جمع کر دیا جائے، ان پر جرح وتعدیل اور نقد وتبصرہ اہلِ علم کے لئے چھوڑ دیا جائے، اور یہ کسی خاص شخص کی اتفاقی غلطی نہیں بلکہ تمام ائمہ فن کی سوچی سمجھی رَوِش تاریخ میں یہی ہے کہ فنِ تاریخ میں ضعیف وسقیم روایات کو بلا تنقید ذکر کر دینا کوئی عیب نہیں۔

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان روایات سے دین کے عقائد و اَحکامِ شرعیہ تو ثابت کرنا نہیں، عبرت ونصیحت اور تجاربِ اقوام وغیرہ کے فوائد حاصل کرنا ہیں، وہ یوں بھی ہوسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان تاریخی روایات سے کسی ایسے مسئلے پر استدلال کرنا چاہتا ہے جس کا تعلق اسلامی عقائد یا اَحکامِ عملیہ سے ہے تو اس کی اپنی ذمہ داری ہے کہ روایات کی تنقید اور راویوں پر جرح وتعدیل کا وہی ضابطہ اختیار کرے جو حدیث کی روایات میں لازم وضروری ہے، اس کے بغیر اس کا استدلال جائز نہیں۔ اور یہ کہنا کہ کسی بڑے ثقہ اور امامِ حدیث کی کتابِ تاریخ میں یہ روایت درج ہے، اس کو اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا۔

اس بات کو اس مثال سے سمجھئے کہ ائمہ مجتہدینؒ اور فقہائے اُمتؒ میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہیں جو فنِ طب کے بھی ماہر ہیں، جیسے امام شافعیؒ وغیرہ، اور بعض حضرات کی تصانیف بھی فنِ طب میں موجود ہیں، یہ حضرات اگر کسی طب کی کتاب میں اشیاء کے خواص وآثار بیان کرتے ہوئے یہ لکھیں کہ شراب میں فلاں فلاں خواص و

آثار ہوتے ہیں، خنزیر کے گوشت پوست اور بال کے فلاں فلاں خواص و آثار ہیں، پھر کوئی آدمی طب کی کتاب میں ان کے کلام کو دیکھ کر ان چیزوں کو جائز قرار دینے لگے اور استدلال میں یہ کہے کہ فلاں امام یا عالم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور وہاں اس کے حرام ہونے کا ذکر بھی نہیں کیا، تو کیا اس کا یہ استدلال دُرست ہوگا؟ اور یہ کوئی فرضی مثال ہی نہیں، شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اُمت کے کیسے بڑے عالم ہیں، علومِ شرعیہ میں سے شاید کوئی فن نہیں چھوڑا جس پر ان کی تصانیف نہ ہوں، ان کی بزرگی اور تقدس میں کسی کو کلام نہیں، مگر موضوعِ طب پر ان کی تصنیف "کتاب الرحمة فی الطب والحکمة" دیکھ لیجئے اس میں متعدد اَمراض کے علاج اور منافع کی تحصیل کے لئے جو نسخے لکھے ہیں، ان میں بہت سی حرام چیزیں بھی شامل ہیں، اب اگر کوئی شخص اس کتاب کے حوالے سے ان کو جائز ثابت کرنے لگے اور سیوطیؒ کی طرف اس کو منسوب کرے تو کیا کوئی صحیح الحواس آدمی اس کو دُرست باور کرسکتا ہے؟ اسی طرح اور بہت سے علماء و فقہاء جن کی تصانیف فنِ طب وغیرہ میں ہیں، سب میں حرام چیزوں کے خواص و آثار اور طریقِ استعمال ذکر کیا جاتا ہے، خون اور انسانی بول و براز اور شراب اور خنزیر سبھی چیزوں کے خواص لکھے جاتے ہیں، اور اس جگہ وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان کا حرام یا نجس ہونا بھی اس جگہ لکھ دیں، کیونکہ یہ موضوعِ طب سے خارج ہے اور دُوسری کتب میں بیان ہوچکا ہے۔ ان کی کتبِ طب سے کوئی آدمی حرام چیزوں کو ان کا نام لے کر حلال کرنے لگے تو اس میں قصور ان کا یا علامہ سیوطیؒ کا نہیں، کہ انہوں نے فنِ طب کی کتاب میں حرام اشیاء کے خواص کیوں لکھے؟ کیونکہ اس فن کا مقتضا اور موضوع ہی یہ ہے کہ سب چیزوں کے خواص و آثار لکھے جاویں، حلال حرام ہونے کی بحث کا یہ موقع نہیں، اور جہاں اس کا موقع ہے وہ ان کے حرام ہونے کو لکھ چکے ہیں۔ قصور اس عقلمند کا ہے جو اس حقیقت کو نظرانداز کرکے طبّی کتاب سے حلال و حرام کے مسائل نکالنے لگے۔ اس طویل تمہید کے بعد

میں اپنے اصل موضوعِ کلام کی طرف آتا ہوں کہ جن حضرات نے مشاجراتِ صحابہ (یعنی صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات) کے معاملے کو تاریخی روایات سے چکانے اور انہیں کی بنیاد پر ان کے فیصلے صادر کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے ان کو مغالطہ یہیں سے لگا ہے کہ یہ تاریخی روایات جن کتابوں سے لی گئی ہیں ان کے مصنّفین بڑے ثقہ علماء اور حدیث و تفسیر کے امام مانے گئے ہیں، اس پر غور نہیں کیا کہ وہ اس کتاب میں عقائد اور اعمالِ شرعیہ کی بحث لے کر نہیں بیٹھے، بلکہ فنِ تاریخ کی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات بلاتنقید جمع کردینے ہی پر اکتفاء کرنے کا معمول معلوم و معروف ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص ان سے عقیدہ یا عمل کا مسئلہ ثابت کرنا چاہے تو روایت اور راوی کی محدّثانہ تنقید و تحقیق اس کی اپنی ذمہ داری ہے، وہ ائمۂ فن اس سے بَری ہیں۔ علمائے محققین نے اس کو پوری طرح واضح کردیا ہے کہ عقائد و اعمالِ شرعیہ کے معاملے میں تاریخی روایات جو عموماً صحیح و سقیم، معتبر و غیرمعتبر کا مخلوط مجموعہ ہوتی ہیں ان کو نہ کسی مسئلے کی سند میں پیش کیا جاسکتا ہے، نہ بلاتحقیقِ محدّثانہ، ان سے استدلال کرکے کوئی مسئلۂ شرعیہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشاجراتِ صحابہ کا مسئلہ کوئی عام تاریخی مسئلہ ہے یا اُحکامِ شرعیہ کا ایک اہم باب ہے؟

صحابہؓ اور مشاجراتِ صحابہ کا مسئلہ

پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معرفت، ان کے درجات اور ان میں پیش آنے والے باہمی اختلافات کا فیصلہ کوئی عام تاریخی مسئلہ نہیں بلکہ معرفتِ صحابہؓ تو علمِ حدیث کا اہم جزء ہے، جیسا کہ مقدمہ ''اصابہ'' میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اور مقدمہ ''استیعاب'' میں حافظ ابنِ عبدالبر رحمہ اللہ نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقام اور باہمی تفاضل و درجات اور ان کے درمیان پیش آنے والے اختلافات کے فیصلے کو علمائے اُمت نے عقیدے کا مسئلہ قرار دیا اور تمام کتبِ عقائدِ اسلامیہ میں اس کو ایک مستقل باب کی حیثیت سے لکھا ہے۔

ایسا مسئلہ جو عقائدِ اسلامیہ سے متعلق ہے اور اسی مسئلے کی بنیاد پر بہت سے اسلامی فرقوں کی تقسیم ہوئی ہے، اس کے فیصلے کے لئے بھی ظاہر ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص اور اِجماعِ اُمت جیسی شرعی حجت درکار ہیں، اس کے متعلق اگر کسی روایت سے استدلال کرنا ہے تو اس کو محدّثانہ اُصولِ تنقید پر پرکھ کر لینا واجب ہے۔ اس کو تاریخی روایتوں میں ڈھونڈنا اور ان پر اعتماد کرنا، اُصولی اور بنیادی غلطی ہے۔ وہ تاریخیں کتنے ہی بڑے ثقہ اور معتمد علمائے حدیث ہی کی لکھی ہوئی کیوں نہ ہوں، ان کی فنی حیثیت ہی تاریخی ہے جس میں صحیح وسقیم روایات جمع کردینے کا عام دستور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ الحدیث امام ابنِ عبدالبر رحمہ اللہ نے جو معرفتِ صحابہؓ کے موضوع پر اپنی بہترین کتاب ''الاستیعاب فی معرفة الأصحاب'' لکھی تو علمائے

اُمت نے اس کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا مگر اس میں مشاجراتِ صحابہؓ کے متعلق کچھ غیر مستند تاریخی روایات بھی شامل کردیں تو عام علمائے اُمت اور ائمۂ حدیث نے اس عمل کو اس کتاب کے لئے ایک بدنما داغ قرار دیا۔

چھٹی صدی ہجری کے امامِ حدیث ابنِ صلاح رحمہ اللہ جن کی کتاب ''علوم الحدیث'' اُصولِ حدیث کی رُوح مانی گئی ہے اور بعد میں آنے والے محدثین نے اسی سے اقتباسات لئے ہیں، یہ اپنی کتاب کے انتالیسویں باب میں (جن کو بعنوان ''انواع'' لکھا گیا ہے) معرفتِ صحابہؓ پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

هٰذا عِلم كبير قد ألّف الناس فيه كتبا كثيرة ومن أجلّها وأكثرها فوائد "كتاب الاستيعاب" لابن عبدالبر لو لا ما شانه به من ايراده كثيرًا مما شجر بين الصحابة وحكاياته عن الاخباريين لا المحدّثين وغالب على الاخباريين الاكثار والتخليط فيما يروونه.

(علوم الحديث ص: ۲۶۲، طبع المدينة المنوّرة)

ترجمہ:- معرفتِ صحابہؓ ایک بڑا علم ہے جس میں لوگوں نے بہت بہت تصانیف لکھی ہیں، اور ان میں سب سے افضل و اعلیٰ اور سب سے زیادہ مفید کتاب ''الاستیعاب'' ہے ابنِ عبدالبرؒ کی، اگر اس کو یہ بات عیب دار نہ کردیتی کہ اس میں مشاجراتِ صحابہؓ کے متعلق تاریخی روایات کو درج کردیا ہے، محدثین کی محدثانہ روایت پر مدار نہیں رکھا، اور یہ ظاہر ہے کہ مؤرخین پر غلبہ اس کا ہے کہ بہت روایات جمع کردی جائیں، جن کی روایت میں معتبر و غیر معتبر روایات خلط ملط ہوتی ہیں۔

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے ''تدریب الراوی'' میں علمِ معرفتِ صحابہؓ پر کلام

کرتے ہوئے ابنِ عبدالبرؒ کی ''استیعاب'' کا ذکر تقریباً انہیں الفاظ میں کیا ہے جو ابنِ صلاحؒ کے اُصولِ حدیث سے اُوپر نقل کئے گئے ہیں، جس میں مشاجراتِ صحابہؓ کی بحث میں تاریخی روایات کے داخل کردینے پر سخت اعتراض کیا ہے۔ (تدریب الراوی ص:۲۹۵)

دُوسرے محدثین نے ''فتح المغیث'' وغیرہ میں ابنِ عبدالبرؒ کے اس طرزِ عمل پر رَدّ کیا ہے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کا مسئلہ جو عقیدے کا مسئلہ ہے اس میں تاریخی روایات کو کیوں داخل کیا۔

وجہ یہ ہے کہ ابنِ عبدالبرؒ کی کتاب ''الاستیعاب'' کوئی عام تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ ''علمِ معرفتِ صحابہؓ'' کی کتاب ہے، جو فنِ حدیث کا جزء ہے، اگر ابنِ عبدالبرؒ نے بھی عام تاریخ پر کوئی کتاب لکھی ہوتی اور اس میں یہ غیر مستند تاریخی روایات لکھتے تو غالباً کسی کو اعتراض نہ ہوتا، جیسا ابنِ جریرؒ، ابنِ کثیرؒ وغیرہ ائمۂ حدیث کی تاریخی کتابوں پر کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا۔

صحابہ کرامؓ کی چند خصوصیات

سابقہ تحریر میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ''صحابہ کرامؓ'' جس مقدس گروہ کا نام ہے وہ اُمت کے عام افراد و رِجال کی طرح نہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان ایک مقدس واسطہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص مقام اور عام اُمت سے امتیاز رکھتے ہیں۔ یہ مقام و امتیاز ان کو قرآن و سنت کی نصوص وتصریحات کا عطا کیا ہوا ہے، اور اسی لئے اس پر اُمت کا اِجماع ہے۔ اس کو تاریخ کی صحیح وسقیم روایات کے انبار میں گم نہیں کیا جاسکتا، اگر کوئی روایت ذخیرۂ حدیث میں بھی ان کے اس مقام اور شان کو مجروح کرتی ہو تو وہ بھی قرآن و سنت کی نصوصِ صریحہ اور اِجماعِ اُمت کے مقابلے میں متروک ہوگی، تاریخی روایات کا تو کہنا کیا ہے۔

نصوصِ قرآنِ کریم

۱:- كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ.

ترجمہ:- تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے (نفع اور اصلاح) کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

۲:- وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ.

ترجمہ:- اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنادیا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تا کہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلے میں گواہ ہو۔

ان دونوں آیتوں کے اصل مخاطب اور پہلے مصداق صحابہ کرامؓ ہیں، باقی اُمت بھی اپنے اپنے عمل کے مطابق اس میں داخل ہوسکتی ہے لیکن صحابہ کرامؓ کا ان دونوں آیتوں کا صحیح مصداق ہونا باتفاقِ مفسرین ومحدثین ثابت ہے۔ ان میں صحابہ کرامؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام انسانوں سے افضل و اعلیٰ اور عدل و ثقہ ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے، ذکرہ ابن عبدالبرؒ فی مقدمة الاستیعاب، اور علامہ سفارینی رحمہ اللہ نے "شرح عقیدة الدرة المضیة" میں اس کو جمہور اُمت کا مسلک قرار دیا ہے کہ انبیاء کے بعد صحابہ کرامؓ افضل الخلائق ہیں۔

ابراہیم بن سعید جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوامامہؓ سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:-

لا نعدل بأصحاب محمد صلى الله عليه وسلم أحدًا.

(الروضة الندية شرح العقيدة الواسطية لابن تيميةؒ ص:۴۰۵)

یعنی ہم اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، افضل ہونا کجا۔

۳:- مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ. الأیة.

ترجمہ:- محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ آپؐ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں، اے مخاطب! تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رُکوع کر رہے ہیں اور کبھی سجدہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں، ان کے آثار بوجہ تأثیرِ سجدہ ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

عامۂ مفسرین امام قرطبیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ "وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" عام ہے، اس میں تمام صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت داخل ہے، اور اس میں تمام صحابہ کرامؓ کی تعدیل، ان کا تزکیہ اور ان پر مدح وثناء خود مالکِ کائنات کی طرف سے آئی ہے۔

ابوعروہ زبیریؒ کہتے ہیں کہ: ہم ایک روز حضرت امام مالکؒ کی مجلس میں تھے، لوگوں نے ایک شخص کا ذکر کیا جو بعض صحابہ کرامؓ کو بُرا کہتا تھا، امام مالکؒ نے یہ آیت "لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّار" تک تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ: جس شخص کے دِل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے کسی کے متعلق غیظ ہو وہ اس آیت کی زَد میں ہے، یعنی اس کا ایمان خطرے میں ہے کیونکہ آیت میں کسی صحابی سے غیظ کفار کی علامت قرار دی گئی ہے۔

"وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ" میں تمام صحابہ کرامؓ کی جماعت بلاکسی استثناء کے داخل ہے۔

۴:- يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ.

ترجمہ:- جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور جو مسلمان (دین کی رو سے) ان کے ساتھ ہیں ان کو رُسوا نہیں کرے گا۔

۵:- وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ. الأية.

ترجمہ:- اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب سے) سابق اور مقدّم ہیں اور (بقیہ اُمت میں) جتنے لوگ اِخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس (اللہ) سے راضی ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

اس میں صحابہ کرامؓ کے دو طبقے بیان فرمائے ہیں، ایک سابقینِ اوّلین کا، دُوسرے بعد میں ایمان لانے والوں کا، اور دونوں طبقوں کے متعلق یہ اعلان کردیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں، ان کے لئے جنت کا مقام دوام مقرّر ہے، جس میں تمام صحابہ کرامؓ داخل ہیں۔ مہاجرین و انصار سے سابقینِ اوّلین کون لوگ ہیں؟ اس کی تفسیر میں ابنِ کثیرؒ نے تفسیر میں اور ابنِ عبدالبرؒ نے مقدمہ ''استیعاب'' میں سندوں کے ساتھ دونوں قول نقل کئے ہیں، ایک یہ کہ سابقینِ اوّلین وہ حضرات ہیں جنھوں نے رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قبلوں یعنی بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہو، یہ قول ابوموسیٰ اشعریؓ، سعید بن مسیّبؒ، ابنِ سیرینؒ، حسن بصریؒ کا ہے (ابنِ کثیر)، اس کا حاصل یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ بیت المقدس

سے بیت اللہ کی طرف جو ہجرت کے دُوسرے سال میں ہوئی ہے، اس سے پہلے جو لوگ مشرف باسلام ہوکر شرفِ صحابیت حاصل کر چکے ہیں وہ سابقینِ اوّلین ہیں۔

دُوسرا قول یہ ہے کہ جو لوگ بیعتِ رضوان یعنی واقعہ حدیبیہ واقع سنہ ۶ ھ میں شریک ہوئے ہیں وہ سابقینِ اوّلین میں سے ہیں، یہ قول امام شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا ہے۔ (ابنِ کثیر، استیعاب)

قرآنِ کریم نے واقعہ حدیبیہ میں درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابہؓ کے متعلق عام اعلان فرمایا ہے: "لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" اسی لئے اس بیعت کا نام "بیعتِ رضوان" رکھا گیا ہے، اور حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا يدخل النار أحد ممن بايع تحت الشجرة.

(ابن عبدالبر بسنده في الاستيعاب)

ترجمہ:- نہیں داخل ہوگا جہنم میں کوئی شخص جس نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے۔

بہرحال سابقینِ اوّلین خواہ قبلتین کی طرف نماز میں شریک ہونے والے ہوں یا بیعتِ رضوان کے شرکاء، ان کے بعد بھی صحابیت کا شرف حاصل کرنے والے تمام صحابہ کرامؓ کو حق تعالیٰ نے "وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ" میں داخل کر کے شامل فرمایا اور سب کے لئے اپنی رضائے کامل اور جنت کی ابدی نعمت کا وعدہ اور اعلان فرمادیا۔

ابنِ کثیر رحمہ اللہ اس کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:-

يا ويل من أبغضهم أو سبّهم أو سبّ بعضهم (الى قوله) فأين هؤلاء من الايمان بالقراٰن اذ يسبّون من رضي الله عنهم. (ابنِ کثیرؒ)

ترجمہ:- عذابِ الیم ہے ان لوگوں کے لئے جو ان حضرات سے یا ان میں بعض سے بغض رکھے یا ان کو بُرا کہے، ایسے لوگوں کو ایمان بالقرآن سے کیا واسطہ جو ان لوگوں کو برا کہتے ہیں جن سے اللہ نے راضی ہونے کا اعلان کردیا۔

اور ابنِ عبدالبر مقدمہ ''استیعاب'' میں یہی آیت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

ومن رضی اللّٰہ عنہ لم یسخط علیہ أبدًا ان شاء اللّٰہ تعالٰی.

یعنی اللہ جس سے راضی ہوگیا پھر اس سے کبھی ناراض نہیں ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو سب اگلی پچھلی چیزوں کا علم ہے، وہ راضی اسی شخص سے ہوسکتے ہیں جو آئندہ زمانے میں بھی رضاء کے خلاف کام کرنے والا نہیں ہے، اس لئے کسی کے واسطے رضائے الٰہی کا اعلان اس کی ضمانت ہے کہ اس کا خاتمہ اور انجام بھی اسی حالتِ صالحہ پر ہوگا، اس سے رضائے الٰہی کے خلاف کوئی کام آئندہ بھی نہ ہوگا۔ یہی مضمون حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے ''شرح عقیدہ واسطیہ'' میں اور سفارینی رحمہ اللہ نے ''شرح درہ مضیۃ'' میں بھی لکھا ہے، اس سے ان ملحدین کے شبہ کا ازالہ خود بخود ہوگیا جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے یہ اعلانات اس وقت کے ہیں جبکہ ان کے حالات دُرست تھے، بعد میں معاذ اللہ ان کے حالات خراب ہوگئے اس لئے وہ اس اِنعام و اِکرام کے مستحق نہیں رہے، نعوذ باللہ منہ، کیونکہ اس سے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شروع میں بوجہ انجام سے بے خبری کے راضی ہوگئے تھے، بعد میں یہ حکم بدل گیا، نعوذ باللہ منہ۔

یہاں پہنچ کر شاید کسی کو حدیث ''اِنی فرطکم علی الحوض'' سے شبہ ہو، جس میں یہ ہے کہ:-

لیرون علیّ أقوام أعرفھم ویعرفوننی ثم یحال بینی

وبينهم. وفى رواية: فأقول: أصحابى، فيقول: لا تدرى ما أحدثوا بعدك. (بخاری باب الحوض)

ظاہر الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ حشر میں بعض اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حوض پر پہنچیں گے تو ان کو وہاں سے ہٹادیا جائے گا، گو حدیث کی شرح میں شراحِ حدیث نے طویل کلام کیا ہے اور جن لوگوں کے بارے میں یہ روایت ہے ان کا مصداق متعین کرنے میں کئی اقوال منقول ہیں، مگر ہمارے نزدیک تمام روایات کو دیکھ کر اور حضراتِ صحابہؓ کے بارے میں قرآن و حدیث میں جو فضائل وارد ہوئے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر امام نووی رحمہ اللہ کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ متعدّد اقوال کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

وقال النووى: هم المنافقون والمرتدون فيجوز أن يحشروا بالغرة والتحجيل لكونهم من جملة الأمة فيُنَاديهم مِن أجل السيما التى عليهم فقال انهم بَدَّلوا بعدك أى لم يموتوا علىٰ ظاهر ما فارقتهم عليه، قال عياض وغيره: وعلىٰ هٰذا فيذهب عنهم الغرة والتحجيل ويطفاء نورهم. (فتح الباری ج:۱۱ ص:۳۲۴)

ترجمہ:- امام نوویؒ نے فرمایا کہ: اس حدیث کا مصداق منافقین ہیں اور وہ لوگ جو (دِل سے زمانۂ نبوّت میں بھی مسلمان نہ تھے بلکہ ظاہراً اسلام کے نام کو اپنائے ہوئے تھے) وفاتِ نبویؐ کے بعد ظاہری اسلام سے پھر گئے، چونکہ یہ لوگ بھی مسلمانوں کے ساتھ دِکھاوے کا وضو کرتے تھے اور نماز میں آتے تھے اس لئے ان کے ہاتھ پاؤں بھی وضو کے اثر سے سفید ہوں گے، ان کی اس علامت کی وجہ سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پکاریں گے،

لیکن جواب دے دیا جائے گا کہ انہوں نے آپ کے بعد حالت بدل دی تھی یعنی جس حال پر آپ نے ان کو چھوڑا تھا اس حالت پر (بھی) باقی نہ رہے اور کھلے کافر ہوگئے، جو ان کے ظاہری دعوائے اسلام کے اعتبار سے ارتداد تھا۔

ہمارے نزدیک یہ قول اس لئے صحیح ہے کہ آیت قرآنیہ:-

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ، قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا.

(الحدید:۱۳)

ترجمہ:- جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرلو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کرلیں، ان کو جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر (وہاں سے) روشنی تلاش کرو۔

کے موافق ہے۔ آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ابتداءِ روزِ قیامت میں منافقین، مؤمنین کے ساتھ لگ جائیں گے، بعد میں علیحدگی ہوجائے گی، لفظ ''ارتدوا'' جو حدیثِ بالا کی بعض روایات میں آیا ہے، اس کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کچھ لوگ مرتد ہوگئے تھے (العیاذ باللہ)۔

لیکن ہمارے نزدیک حق بات یہ ہے کہ اگر ارتداد سے ارتداد عن الاسلام ہی مراد ہو تب بھی اس سے وہ اَعراب مراد ہیں جنھوں نے اسلام کی رَو میں آکر زبان سے یوں کہہ دیا تھا کہ ہم مسلمان ہیں، اور صحیح معنی میں اُن کے دِل میں اسلام جاگزیں نہ ہوا تھا جس کو قرآن میں اس طرح ذکر فرمایا:-

قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ. (الحجرات:۱۴)

ترجمہ:- یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرمادیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم مخالفت چھوڑ کر مطیع ہوگئے، اور ابھی تک ایمان تمہارے دِلوں میں داخل نہیں ہوا۔

حافظ خطابی رحمہ اللہ نے کیسی اچھی بات لکھی ہے:-

لم يرتد من الصحابة أحدٌ وانما ارتد قومٌ من جفاة الأعراب ممن لا نصرة لهٗ في الدين وذٰلك لا يوجب قدحًا في الصحابة المشهورين ويدل قولهٗ أصيحابي بالتصغير علٰى قلة عددهم. (فتح الباری ج:١١ ص:٣٢٤)

ترجمہ:- حضراتِ صحابہؓ میں سے کوئی بھی مرتد نہیں ہوا، بعض گنوار اَعرابی جن کا دین کی نصرت میں کوئی دخل نہیں رہا (صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا) وہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں مرتد ہوگئے تھے، اس سے مشہور صحابہ کرامؓ کے بارے میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوتا، اور خود حدیث کے الفاظ میں ان کو "اصحابی" کے بجائے "اصیحابی" بصیغۂ تصغیر لانا بھی اس طرح مشیر ہے۔

٦:- **قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ.**

ترجمہ:- آپؐ فرمادیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف سے دعوت دیتا ہوں بصیرت کے ساتھ میں بھی اور جن لوگوں نے میرا اِتباع کیا وہ بھی۔

ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ومتبع تھے، سب اس میں داخل ہیں۔

۷:- قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (مع قوله تعالٰى) ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ، وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ، وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ. (فاطر:۳۲)

ترجمہ:- آپؐ کہہ دیجئے کہ حمد سب اللہ کے لئے ہے اور سلام ہے ان بندوں پر جن کو اللہ نے منتخب فرمایا ہے۔ (اس کے ساتھ دُوسری آیت میں ہے) پھر وارث بنادیا ہم نے کتاب کا ان لوگوں کو جن کا ہم نے اپنے بندوں میں سے انتخاب کیا، پھر بعض تو ان میں اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں، اور بعض ان میں متوسط درجے کے ہیں، اور بعض ان میں وہ ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں، یہ بڑا فضل ہے۔

اس آیت میں صحابہ کرامؓ کو ''منتخب بندے'' قرار دیا گیا ہے، آگے ان ہی کی ایک قسم یہ بھی قرار دی ہے کہ ''ان میں بعض اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں'' معلوم ہوا کہ اگر کسی صحابی سے کسی وقت کوئی گناہ ہوا بھی ہے تو وہ معاف کردیا گیا، ورنہ پھر ان کو ''منتخب بندوں'' کے ذیل میں ذکر نہ فرمایا جاتا۔

ظاہر ہے کہ کتاب یعنی قرآن کے پہلے وارث جن کو یہ کتاب ملی ہے، صحابہ کرامؓ ہیں، اور نصِ قرآنی کی رُو سے وہ اللہ کے منتخب بندے ہیں، اور پہلی آیت میں ان منتخب بندوں پر اللہ کی طرف سے سلام آیا ہے، اس طرح تمام صحابہ کرامؓ اس سلامِ خداوندی میں شامل ہیں (کذا ذکرہ السفارینی فی شرح الدّرۃ المضیئۃ)۔

۸:- سورۂ حشر میں حق تعالیٰ نے عہدِ رسالت کے تمام موجود اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کا تین طبقے کرکے ذکر کیا ہے، پہلا مہاجرین کا، جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا:-

أُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ.

یعنی یہی لوگ سچے ہیں۔

دُوسرا انصار کا، جن کی صفات و فضائل ذکر کرنے کے بعد قرآنِ کریم نے فرمایا:-

أُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

یعنی یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو مہاجرین و انصار کے بعد قیامت تک آنے والا ہے، ان کے بارے میں فرمایا:-

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا.

ترجمہ:- اور وہ لوگ جو بعد میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری بھی مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، اور ہمارے دِلوں میں ایمان لانے والوں سے کوئی بغض نہ کرنا۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مہاجرین و انصار صحابہؓ کے لئے اِستغفار کرنے کا حکم سب مسلمانوں کو دیا ہے اور یہ حکم اس حال میں دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے باہم جنگ و مقاتلہ بھی ہوگا۔ علماء نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے بعد اسلام میں اس شخص کا کوئی مقام نہیں جو صحابہ کرامؓ سے محبت نہ رکھے اور ان کے لئے دُعا نہ کرے۔

۹:- وَلٰـکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ

وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ. فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ.

(الحجرات:۷،۸)

ترجمہ:- لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب کردیا، اور اس کو تمہارے دِلوں میں مزین بنادیا، اور کفر، فسوق اور نافرمانی کو تمہارے لئے مکروہ بنادیا، ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور نعمت سے ہدایت یافتہ ہیں، اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بھی بلا استثناء تمام صحابہ کرامؓ کے لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے ان کے دِلوں میں ایمان کی محبت اور کفر وفسوق اور گناہوں کی نفرت ڈال دی ہے۔

اس جگہ فضائلِ صحابہؓ کی سب آیات کا استیعاب پیشِ نظر نہیں، ان کے مقام اور درجے کو ثابت کرنے کے لئے ایک دو آیتیں بھی کافی ہیں جن سے ان کا مقبول عند اللہ ہونا، اللہ تعالیٰ کا ان سے راضی ہونا اور ابدی جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہونا ثابت ہے۔

یہاں یہ بات پھر سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ ارشادات اس ذاتِ حق کے ہیں جو سب کو پیدا کرنے والا اور پیدائش سے پہلے ہر انسان کے ایک ایک سانس، ایک ایک قدم سے اور اچھے بُرے عمل سے واقف ہے جو اس شخص سے وقوع میں آئیں گے، اس نے صحابہ کرامؓ کے معاملے میں جو اپنی رضائے کامل اور جنت کی بشارت دی ہے، ان سب واقعات و معاملات کو جانتے ہوئے دی ہے جو ان میں سے ہر ایک کو عہدِ رسالت میں یا اس کے بعد پیش آنے والے تھے۔

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول" میں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ اسی بندے سے راضی ہوسکتے ہیں جس کے بارے

میں اس کو معلوم ہو کہ وہ آخر عمر تک موجباتِ رضاء کو پورا کرے گا، اور جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جاوے تو پھر کبھی اس سے ناراض نہیں ہوتا۔

صحابہ کرامؓ کا خصوصی مقام احادیثِ نبویہ میں

جن احادیثِ نبویہ میں ان حضرات کے فضائل و درجات کا ذکر ہے، ان کو شمار کرنا اور لکھنا آسان بھی نہیں اور ضرورت بھی نہیں، اس لئے یہاں چند روایات لکھی جاتی ہیں جن میں پوری جماعتِ صحابہؓ کے فضائل وخصوصیات کا ذکر ہے، خاص خاص افراد یا جماعتوں کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس کو چھوڑا جاتا ہے۔

ا:- صحیحین اور تمام کتبِ اُصول میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، فَلَا أَدْرِيْ ذَكَرَ قَرْنَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةً، ثُمَّ إِنَّ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ وَيَنْذِرُوْنَ وَلَا يُوْفُوْنَ وَيَظْهَرُ فِيْهِمُ السِّمَنُ.

(للستة الا مالکا، جمع الفوائد ج:۲ ص:۴۹۰ طبع مصر)

ترجمہ:- بہترین قرن میرا ہے، پھر ان لوگوں کا جو اس سے متصل ہے، پھر ان لوگوں کا جو اس سے متصل ہے، راوی کہتے ہیں کہ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ متصل لوگوں کا ذکر دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ۔ اس کے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو بے کہے شہادت دینے کو تیار نظر آویں، خیانت کریں گے، امانت دار نہ ہوں گے، عہد شکنی کریں گے معاہدے پورے نہ کریں گے، اور ان میں (بوجہ بے فکری کے) مٹاپا ظاہر ہو جائے گا۔

اس حدیث میں متصل آنے والے لوگوں کا اگر دو مرتبہ ذکر فرمایا ہے تو دُوسرا قرن صحابہؓ اور تیسرا تابعینؒ کا ہے، اور اگر تین مرتبہ ذکر فرمایا ہے تو چوتھا قرن تبع تابعینؒ کا بھی اس میں شامل ہوگا۔

۲:- صحیحین اور ابوداؤد و ترمذی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِیْ فَإِنَّ أَحَدَکُمْ لَوْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِیْفَهٗ. (جمع الفوائد)

ترجمہ:- میرے صحابہ کو برا نہ کہو، کیونکہ تم میں سے کوئی آدمی اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو صحابی کے ایک مُد بلکہ آدھے مُد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔

"مُد" عرب کا ایک پیمانہ ہے جو وزن کے لحاظ سے آج کل کے مروّج تقریباً ایک سیر کے برابر ہوتا ہے۔ اس حدیث نے بتلایا کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت وصحبت وہ نعمتِ عظیمہ ہے جس کی برکت سے صحابی کا ایک عمل دُوسروں کے مقابلے میں وہ نسبت رکھتا ہے کہ ان کا ایک سیر بلکہ آدھا سیر دُوسروں کے پہاڑ برابر وزن سے بڑھا ہوا ہوتا ہے، ان کے اعمال کو دُوسروں کے اعمال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اس حدیث کے شروع میں جو یہ ارشاد ہے: "لا تسبّوا أصحابی" یعنی میرے صحابہؓ پر سَبّ نہ کرو، لفظِ "سَبّ" کا ترجمہ اُردو میں عموماً "گالی دینا" کیا جاتا ہے، جو اس لفظ کا صحیح ترجمہ نہیں، کیونکہ "گالی" کا لفظ اُردو زبان میں فحش کلام کے لئے آتا ہے، حالانکہ لفظ "سَبّ" عربی زبان میں اس سے زیادہ عام ہے، ہر اس کلام کو عربی میں "سَبّ" کہا جاتا ہے جس سے کسی کی تنقیص ہوتی ہو، گالی کے لئے ٹھیٹ لفظ عربی میں "شتم" آتا ہے۔

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے "الصارم المسلول" میں فرمایا کہ: اس حدیث میں لفظِ "سَبّ" ایسے عام معنی کے لئے آیا ہے جو لعن طعن کرنے کے مفہوم سے عام ہے۔ اسی لئے احقر نے اس کا ترجمہ "بُرا کہنے" سے کیا ہے۔

۳:- ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَللّٰہَ! اللّٰہَ! فِیْ أَصْحَابِیْ، لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ، فَمَنْ أَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ أَحَبَّھُمْ وَمَنْ أَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ أَبْغَضَھُمْ، وَمَنْ اٰذَاھُمْ فَقَدْ اٰذَانِیْ وَمَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰہَ، وَمَنْ اٰذَی اللّٰہَ فَیُوْشِکُ أَنْ یَأْخُذَہٗ. (جمع الفوائد ج:۲ ص:۴۹۱)

ترجمہ:- اللہ سے ڈرو! اللہ سے ڈرو! میرے صحابہؓ کے معاملے میں، میرے بعد ان کو (طعن و تشنیع کا) نشانہ نہ بناؤ کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کے ساتھ ان سے محبت کی، اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض رکھا، اور جس نے ان کو ایذاء پہنچائی اس نے مجھے ایذاء پہنچائی، اور جس نے مجھے ایذاء دی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچائی، اور جو اللہ کو ایذاء پہنچانا چاہتا ہے تو قریب ہے کہ اللہ اس کو عذاب میں پکڑ لے گا۔

اس حدیث میں جو یہ فرمایا کہ جس نے صحابہ کرامؓ سے محبت رکھی وہ میری محبت کے ساتھ محبت رکھی، اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ صحابی سے محبت رکھنا میری محبت کی علامت ہے۔ ان سے وہی شخص محبت رکھے گا جس کو میری محبت حاصل ہو۔ دُوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جو شخص میرے کسی صحابی سے محبت رکھتا ہے تو میں اس سے محبت رکھتا ہوں، اس طرح اس کی محبت صحابی کے ساتھ علامت اس کی

سمجھو کہ مجھے اس شخص سے محبت ہے۔ یہی دو معنے اگلے جملے بغضِ صحابہؓ کے ہوسکتے ہیں کہ جو شخص کسی صحابی سے بغض رکھتا ہے وہ دراصل مجھ سے بغض ہوتا ہے، یا یہ کہ جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے تو میں اس شخص سے بغض رکھتا ہوں۔

دونوں معنے میں سے جو بھی ہوں یہ حدیث ان حضرات کی تنبیہ کے لئے کافی ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آزادانہ تنقید کا نشانہ بناتے اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن کو دیکھنے والا ان سے بدگمان ہوجائے یا کم از کم ان کا اعتماد اس کے دِل میں نہ رہے۔ غور کیا جائے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغاوت کے حکم میں ہے۔

۴:- ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اذا رأیتم الذین یسبُّون أصحابی فقولوا: لعنة اللّٰه علٰی شرکم. (جمع الفوائد ج:۲ ص:۴۹۱)

ترجمہ:- جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو بُرا کہتے ہیں تو تم ان سے کہو خدا کی لعنت ہے اس پر جو تم دونوں یعنی صحابہؓ اور تم سے بدتر ہیں۔

ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مقابلے میں بدتر وہی ہے جو ان کو بُرا کہنے والا ہے۔ اس حدیث میں صحابی کو بُرا کہنے والا مستحقِ لعنت قرار دیا گیا ہے، اور یہ اُوپر گزر چکا ہے کہ لفظِ "سَبّ" عربی زبان کے اعتبار سے صرف فحش گالی ہی کو نہیں کہتے بلکہ ہر ایسا کلام جس سے کسی کی تنقیص وتوہین یا دِل آزاری ہوتی ہے وہ لفظِ "سَبّ" میں داخل ہے۔

۵:- ابوداؤد، ترمذی میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سنا کہ بعض لوگ بعض امرائے حکومت کے سامنے حضرت علی کرّم اللہ

وجہ کو بُرا کہتے ہیں، تو سعید بن زیدؓ نے فرمایا: افسوس! میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے سامنے اصحابِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا کہا جاتا ہے اور تم اس پر نکیر نہیں کرتے اور اس کو روکتے نہیں (اب سن لو) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا ہے (اور پھر حدیث بیان کرنے سے پہلے فرمایا کہ یہ بھی سمجھ لو کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کروں جو آپ نے نہ فرمائی ہو کہ قیامت کے روز جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملوں تو آپ مجھ سے اس کا مؤاخذہ فرماویں، یہ کہنے کے بعد حدیث بیان کی کہ) ابوبکر جنت میں ہیں، عمر جنت میں ہیں، عثمان جنت میں ہیں، علی جنت میں ہیں، طلحہ جنت میں ہیں، زبیر جنت میں ہیں، سعد بن مالک جنت میں ہیں، عبدالرحمٰن بن عوف جنت میں ہیں، ابوعبیدہ بن جراح جنت میں ہیں، یہ نو حضرات صحابہؓ کے نام لے کر دسویں کا نام نہیں لیا، جب لوگوں نے پوچھا دسواں کون ہے؟ تو ذکر کیا سعید بن زید (یعنی خود اپنا نام ابتداءً بوجہ تواضع کے ذکر نہیں کیا تھا، لوگوں کے اصرار پر ظاہر کیا) اس کے بعد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

واللہ! لمشهد رجل منهم مع النبی صلی الله علیه وسلم یغبّر فیه وجهه خیر من عمل أحدکم ولو عُمِّر عمر نوح.

(جمع الفوائد ج:۲ ص:۴۹۲ طبع مصر)

ترجمہ:- خدا کی قسم ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں اس کا چہرہ غبار آلود ہو جائے، غیر صحابہ سے ہر شخص کی عمر بھر کی عبادت و عمل سے بہتر ہے اگرچہ اس کو عمرِ نوح (علیہ السلام) عطا ہو جائے۔

۶:- امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:-

من كان متأسيا فليتأس بأصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فانهم أبرّ هٰذه الأمة قلوبًا وأعمقها علمًا وأقلها تكلّفًا وأقومها هديًا وأحسنها حالًا، قوم اختارهم الله بصحبة نبيه واقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوا اٰثارهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم.

(شرح عقیدہ سفارینی ج:۲ ص:۲۸۰)

ترجمہ:- جو شخص اقتداء کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرے، کیونکہ یہ حضرات ساری اُمت سے زیادہ اپنے قلوب کے اعتبار سے پاک، اور علم کے اعتبار سے گہرے، اور تکلف و بناوٹ سے الگ، اور عادات کے اعتبار سے معتدل، اور حالات کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ یہ وہ قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور دین کی اقامت کے لئے پسند فرمایا ہے، تو تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے آثار کا اتباع کرو کیونکہ یہی لوگ مستقیم طریق پر ہیں۔

۷:- اور ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:-

ان الله نظر في قلوب العباد فنظر قلب محمد صلى الله عليه وسلم فبعثهٗ برسالته، ثم نظر في قلوب العباد بعد قلب محمد صلى الله عليه وسلم فوجد قلوب أصحابه خير قلوب العباد، فاختارهم لصحبة نبيه، ونصرة دينه.

(سفارینی شرح الدرۃ المضیۃ ج:۲ ص:۲۸۰)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے اپنے سب بندوں کے دِلوں پر نظر ڈالی تو

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سب قلوب میں بہتر پایا، ان کو اپنی رسالت کے لئے مقرّر کردیا، پھر قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دُوسرے قلوب پر نظر فرمائی تو اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلوب کو دُوسرے سب بندوں کے قلوب سے بہتر پایا، ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کی نصرت کے لئے پسند کرلیا۔

۸:- مسندِ بزار میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بہ سندِ صحیح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ان الله اختار أصحابی علی العالمین سوی النبیّین والمرسلین واختار لی من أصحابی أربعة یعنی أبابکر وعمر وعثمان وعلی فجعلهم أصحابی. وقال: فی أصحابی کلهم خیر.

۹:- اور عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ان الله اختارنی واختار لی أصحابی فجعل منهم وزراء واختانا وأصهارًا فمن سبّهم فعلیه لعنة الله والملٰئکة والناس أجمعین، ولا یقبل الله منه یوم القیامة صرفا ولا عدلا. (تفسیرِ قرطبی، سورۃ الفتح، مجمع الزوائد ۱۰-۱۲)

۱۰:- حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

انه من یعش منکم فسیری اختلافًا کثیرًا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین عضّوا علیها بالنواجذ، وایاکم

ومحدثات الأمور فان كل بدعة ضلالة.

(رواه الامام أحمد وأبوداؤد والترمذي وابن ماجة وقال الترمذي: حديث حسن صحيح، وقال أبو نعيم: حديث جيّد صحيح. از سفارینی ص: ۲۸۰)

ترجمہ:- تم میں جو شخص میرے بعد رہے تو بہت اختلافات دیکھے گا، تو تم لوگوں پر لازم ہے کہ میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرو، اس کو دانتوں سے مضبوط تھامو، اور نوایجاد اعمال سے پرہیز کرو کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کی طرح خلفائے راشدینؓ کی سنت کو بھی واجب الاتباع اور فتنوں سے نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح دُوسری متعدّد احادیث اور متعدّد صحابہ کرامؓ کے نام لے کر مسلمانوں کو ان کی اقتداء و اتباع اور ان سے ہدایت حاصل کرنے کی تلقین فرمائی ہے، یہ روایات سب کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔

قرآن وسنت میں مقامِ صحابہؓ کا خلاصہ

مذکور الصدر آیاتِ قرآنی اور روایاتِ حدیث میں یہی نہیں کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا اور ان کو رضوانِ الٰہی اور جنت کی بشارت دی گئی ہے، بلکہ اُمت کو ان کے ادب واحترام اور ان کی اقتداء کا حکم بھی دیا گیا ہے، ان میں سے کسی کو بُرا کہنے پر سخت وعید بھی فرمائی ہے، ان کی محبت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، ان سے بغض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض قرار دیا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہی وہ منصب اور درجہ ہے جس کو زیرِ نظر مقالے "مقامِ صحابہؓ" میں پیش کرنا ہے۔

اس پر اُمتِ محمدیہ کا اِجماع

ایک دو گمراہ فرقوں کو چھوڑ کر باقی اُمتِ محمدیہ کا ہمیشہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں اسی اُصول پر اِجماع و اِتفاق رہا ہے جو اُوپر کتاب و

سنت کی نصوص سے ثابت کیا گیا ہے۔

۱:- صحابہ کرامؓ کے بعد دُوسرا قرن حضراتِ تابعینؒ کا ہے جس کو احادیثِ مذکورہ میں ''خیر القرون'' میں داخل کیا ہے، اس خیر القرون حضراتِ تابعینؒ میں بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سب سے افضل مانے گئے ہیں، انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں صحابہ کرامؓ کے اس مقام کی وضاحت اور لوگوں کو اس کے پابند ہونے کی تاکید الفاظِ ذیل میں فرمائی ہے، یہ طویل مکتوب حدیث کی مشہور کتاب متداول کتاب ابوداؤد میں سند کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس کے ضروری جملے جو مقامِ صحابہؓ کے متعلقہ ہیں یہ ہیں:-

فارض لنفسک ما رضی به القوم لأنفسهم فانهم علىٰ علم وقفوا وببصر نافد كفّوا وهم علىٰ كشف الأمور كانوا أقوى وبفضل ما كانوا فيه أولىٰ فان كان الهدى ما أنتم عليه لقد سبقتموهم اليه ولئن قلتم انّما حدث بعدهم ما أحدثه الّا من اتّبع غير سبيلهم ورغب بنفسه عنهم فانهم هم السابقون فقد تكلّموا فيه بما يكفي ووصفوا منه ما يشفي فما دونهم من مقصر وما فوقهم من محسرٍ وقد قصّر قوم دونهم فجفوا وطمع عنهم أقوام فغلوا وانّهم بين ذٰلک لعلىٰ هدىً مستقيم ... الخ.

ترجمہ:- پس تمہیں چاہئے کہ اپنے لئے وہی طریقہ اختیار کرلو جس کو قوم (صحابہ کرامؓ) نے اپنے لئے پسند کرلیا تھا، اس لئے کہ وہ جس حد پر ٹھہرے علم کے ساتھ ٹھہرے، اور انہوں نے جس چیز سے لوگوں کو روکا، ایک دُوربین نظر کی بناء پر روکا اور بلاشبہ وہ ہی حضرات دقیق حکمتوں اور علمی اُلجھنوں کے کھولنے پر قادر تھے اور جس کام میں تھے اس میں سب سے زیادہ فضیلت

کے وہی مستحق تھے۔ پس اگر ہدایت اس طریق میں مان لی جائے جس پر تم ہو تو اس کے یہ معنے ہیں کہ تم فضائل میں ان سے سبقت لے گئے (جو بالکل محال ہے)، اگر تم یہ کہو کہ یہ چیزیں ان حضرات کے بعد پیدا ہوئی ہیں (اس لئے ان سے یہ طریقہ منقول نہیں) تو سمجھ لو کہ ان کو ایجاد کرنے والے وہی لوگ ہیں جو ان کے راستے پر نہیں ہیں اور ان سے علیحدہ رہنے والے ہیں کیونکہ یہی حضرات سابقین ہیں جو معاملاتِ دین میں اتنا کلام کر گئے ہیں جو بالکل کافی ہے اور اس کو اتنا بیان کردیا جو شفا دینے والا ہے، پس ان کے طریقے سے کمی و کوتاہی کرنے کا بھی موقع نہیں ہے، اور ان سے زیادتی کرنے کا بھی کسی کو حوصلہ نہیں ہے اور بہت سے لوگوں نے ان کے طریقے میں کوتاہی کی وہ مقصد سے دُور رہ گئے، اور بہت سے لوگوں نے ان کے طریقے سے زیادتی کا ارادہ کیا وہ غلوّ میں مبتلا ہوگئے، اور یہ حضرات افراط وتفریط اور کوتاہی کے درمیان ایک راہِ مستقیم پر تھے۔

افضل التابعین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جن کی خلافت کو بعض علماء نے خلافتِ راشدہ کے ساتھ ملایا ہے اور ان کے دورِ خلافت میں اسلامی قوانین کی تنفیذ اور شعائرِ اسلام کا اعلاء بلاشبہ خلافتِ راشدہ ہی کے طرز پر ہوا ہے، ان کے اس ارشاد کے مطابق ایک دو گمراہ فرقوں کے علاوہ پوری اُمتِ محمدیہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق اسی عقیدے پر اِجماع و اتفاق کیا ہے، اس اِجماع کا عنوان عام طور پر کتبِ حدیث اور کتبِ عقائد میں یہ ہے کہ: "الصحابۃ کلھم عدول" حاصل مفہوم اس جملے کا وہی ہے جو اُوپر کتاب وسنت کے حوالوں سے صحابہ کرامؓ کے درجے و مقام کے متعلق لکھا گیا ہے۔

”الصّحابة کلُّھم عُدول“ کا مفہوم

لفظِ ”عدول“ عدل کی جمع ہے، یہ اصل میں مصدر ہے جسے برابر کرنے کے معنی میں، اور محاورات میں اس شخص کو ”عدل“ کہا جاتا ہے جو حق و انصاف پر قائم ہو، یہ لفظ قرآنِ کریم میں بھی بار بار آیا ہے، حدیث میں بھی، کتبِ تفسیر میں بھی اس پر بحث ہے اور اُصولِ حدیث، اُصولِ فقہ اور عام فقہ میں اس کے اصطلاحی اور شرعی معنی کی تعیین کی گئی ہے، ابنِ صلاح رحمہ اللہ نے فرمایا:-

تفصیله أن یکون مسلمًا بالغًا عاقلًا، سالمًا من أسباب الفسق وخوارم المروءة. (علوم الحدیث لابن صلاحؒ)

ترجمہ:- اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان مسلمان، بالغ، عاقل ہو اور اسبابِ فسق سے، نیز خلافِ مروّت افعال سے محفوظ ہو۔

اور شیخ الاسلام نووی رحمہ اللہ نے ”تقریب“ میں فرمایا:-

عدلا ضابطًا بأن یکون مسلمًا، بالغًا، عاقلًا، سلیمًا من أسباب الفسق وخوارم المروءة.

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی شرح ”تدریب“ میں فرمایا:-

وفسر العدل بأن یکون مسلمًا بالغًا عاقلًا (الٰی قوله) سلیمًا من أسباب الفسق وخوارم المروءة.

(تدریب الراوی ص:۱۹۷)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "شرح نخبة الفكر" میں فرمایا:-

والمراد بالعدل من لهٗ ملكة تحمله علٰى ملازمة التقوى والمروة والمراد بالتقوىٰ اجتناب الأعمال السيئة من شركة أو فسق أو بدعة.

ترجمہ:- "عدل" سے مراد وہ شخص ہے جسے ایسا ملکہ حاصل ہو جو اُسے تقویٰ اور مروّت کی پابندی پر برانگیختہ کرے، اور تقویٰ سے مراد شرک، فسق اور بدعت جیسے اعمالِ بد سے اجتناب ہے۔

"الدر المختار، کتابُ الشهادت" میں عدالت کی تفسیر یہ کی ہے:-

ومن ارتكب صغيرة بلا اصرارٍ وان اجتنب الكبائر كلها، وغلب صوابهٗ علٰى صغائره، درر وغيرها، قال: وهو معنى العدالة. قال: ومتى ارتكب كبيرة سقطت عدالته.

ترجمہ:- اور وہ شخص (بھی عادل ہے) جس سے صغیرہ گناہ بغیر اصرار (مداومت) کے صادر ہوجاتا ہو بشرطیکہ وہ تمام کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتا ہو، اور اس کے دُرست افعال اس کے صغیرہ گناہوں سے زیادہ ہوں (درر وغیرہ)۔ یہی عدالت کے معنی ہیں، اور کوئی شخص جب کبھی کسی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، اس کی عدالت ساقط ہوجائے گی۔

اس کی شرح میں ابنِ عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا:-

في الفتاوى الصغرىٰ حيث قال: العدل من يجتنب الكبائر كلّها حتى لو ارتكب كبيرة تسقط عدالته، وفي

الصغائر العبرة بغلبه أو الاصرار على الصغيرة فتصير كبيرة ولذا قال: غلب صوابه آه. قولهٗ (سقطت عدالته وتعود اذا تاب .... الخ.

(رد المحتار ابن عابدين شامیؒ ص:۵۲۳)

ترجمہ:- فتاویٰ صغریٰ میں لکھا ہے کہ ''عدل'' وہ جو تمام کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو، یہاں تک کہ اگر ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب بھی کرلے گا تو اس کی عدالت ساقط ہوجائے گی، اور صغیرہ گناہوں میں اعتبار اکثریت کا ہے، یا پھر کسی صغیرہ گناہ پر اصرار (مداومت) کا، کیونکہ اس صورت میں صغیرہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے، اسی لئے مصنف (درمختار) نے یہ کہا ہے کہ اس کے دُرست افعال زیادہ ہوں۔ اور مصنف نے جو یہ کہا کہ کبیرہ کے ارتکاب سے عدالت ساقط ہوجائے گی، (اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہئے کہ) اگر وہ توبہ کرلے تو عدالت لوٹ آئے گی۔

فقہاء ومحدثین کی مذکورہ بالا تصریحات میں ''عدل'' اور ''عدالت'' کی ایک ہی تفسیر ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان عاقل بالغ ہو اور کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو، کسی صغیرہ گناہ پر مصر نہ ہو اور بہت صغیرہ گناہوں کا عادی نہ ہو، یہی مفہومِ شرعی ہے ''تقویٰ'' کا، جیسا کہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ کی عبارتِ مذکورہ میں ہے، جس کا بالمقابل ''فسق'' ہے، جس شخص کی عدالت کو ساقط قرار دیا جائے گا تو اصطلاحِ شرع میں اس کو ''فاسق'' کہا جائے گا۔ اُوپر جن حضرات سے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ''عدول'' ہونے پر اِجماعِ اُمت نقل کیا گیا ہے ان کی اپنی اپنی عبارتوں سے بھی ''عدل'' اور ''عدالت'' کی یہی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

ایک اِشکال و جواب

یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف اُمت کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ صحابہ کرامؓ معصوم نہیں، ان سے کبیرہ صغیرہ ہر طرح کے گناہ کا صدور ہوسکتا ہے اور ہوا بھی ہے، دُوسری طرف یہ عقیدہ اُوپر لکھا گیا ہے کہ سب کے سب ''عدول'' ہیں، اور ''عدل'' کے معنیٔ اصطلاحی بھی سب کے نزدیک یہ ہیں جو کسی گناہِ کبیرہ کا مرتکب اور صغیرہ پر مصر نہ ہو، اور جس سے گناہِ کبیرہ سرزد ہوگیا یا صغیرہ پر اصرار ثابت ہوگیا وہ ''ساقط العدالت'' کہلائے گا، جس کا اصطلاحی نام ''فاسق'' ہے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ان دونوں عقیدوں میں ہے۔

اس کا جواب جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے اگرچہ کوئی بڑا کبیرہ گناہ بھی سرزد ہوسکتا ہے اور ہوا بھی ہے، مگر ان میں اور عام افرادِ اُمت میں ایک فرق ہے کہ گناہِ کبیرہ وغیرہ سے جو کوئی شخص ساقط العدالة یا فاسق ہوجاتا ہے، اب اس کی مکافات توبہ سے ہوسکتی ہے، جس نے توبہ کرلی یا کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس کی حسنات کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کا یہ گناہ معاف کردیا، وہ پھر ''عدل'' اور ''متقی'' کہلائے گا، اور جس نے توبہ نہ کی وہ ساقط العدالة فاسق قرار دیا جائے گا۔

اب توبہ کے معاملے میں عام افرادِ اُمت اور صحابہ کرامؓ میں ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ عام افرادِ اُمت کے بارے میں یہ ضمانت نہیں ہے کہ انہوں نے توبہ کی یا نہیں کی؟ اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی حسنات نے سب سیئات کا کفارہ کردیا۔ ان کے بارے میں جب تک توبہ کا ثبوت نہ ہوجائے یا کسی ذریعے سے عنداللہ معافی کا علم نہ ہوجائے ان کو ساقط العدالة فاسق ہی قرار دیا جائے گا، نہ ان کی شہادت مقبول ہوگی، نہ دُوسرے معاملات میں ان کا اعتبار کیا جائے گا، مگر صحابہ کرامؓ کا معاملہ

ایسا نہیں، اوّل تو ان کے حالات کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ گناہ سے کتنے ڈرتے اور بچتے تھے، اور کبھی کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو اس کی توبہ صرف زبانی کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کوئی اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لئے پیش کردیتا ہے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا ہے، جب تک قبولِ توبہ کا اطمینان نہیں ہوجاتا اس کو صبر نہیں آتا۔ صحابہ کرامؓ کے اس خوف و خشیت کا تقاضا یہ ہے کہ جن حضرات سے توبہ کرنے کا اظہار بھی نہیں ہوا ہم ان کے بارے میں بھی یہی ظن رکھیں کہ انہوں نے ضرور توبہ کرلی ہوگی، دُوسرے ان کے حسنات اور سوابق اتنے عظیم اور بھاری ہیں کہ ان کے مقابلے میں عمر بھر کا ایک آدھ گناہ حق تعالیٰ کے وعدے کے مطابق معاف ہی ہوجانا چاہئے، وعدہ یہ ہے: "اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ"۔

یہاں تک تو ہر مسلمان کو خود بھی بغیر کسی واضح دلیل کے یہ اعتقاد و اعتماد رکھنا عقل و انصاف کا تقاضا ہے، مگر صحابہ کرامؓ کے معاملے میں ہمارا صرف یہ گمان ہی نہیں، قرآنِ کریم نے اس گمان کی تصدیق بار بار کردی، کبھی صحابہ کرامؓ کی خاص خاص جماعتوں کے لئے اس کا اعلان کردیا، کبھی صحابہ کرامؓ و سابقین و آخرین کے لئے اعلانِ عام کردیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔

بیعتِ حدیبیہ جس کو قرآنی بشارت کی وجہ سے "بیعتِ رضوان" اور "بیعتِ شجرہ" بھی کہا جاتا ہے، اس میں جو تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کرامؓ شریک تھے، ان کے بارے میں کھلے الفاظ سے یہ اعلان فرمایا:-

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ.

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے راضی ہوگیا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس بیعت تحت الشجرۃ میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کسی کو جہنم کی آگ نہ چھو سکے گی۔ اس مضمون پر

متعدّد احادیث مختلف الفاظ، اسنادِ صحیحہ کے ساتھ کتبِ حدیث وتفسیر میں موجود ہیں، اور عام صحابہ کرامؓ اوّلین وآخرین کے حق میں یہ اعلان سورۂ توبہ میں اس طرح آیا:-

وَالسّٰبِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ.

ترجمہ:- مہاجرین و انصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور جنھوں نے نیکی کے ساتھ ان کی اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ عظیم کامیابی ہے۔

سورۃ الحدید میں صحابہ کرامؓ کے بارے میں اعلان فرمایا:-

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى.

ترجمہ:- اللہ نے ان میں سے ہر ایک سے حسنیٰ کا وعدہ کرلیا ہے۔

پھر سورۂ انبیاء میں "حُسنیٰ" کے متعلق یہ ارشاد ہے:-

إِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى أُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ.

یعنی وہ لوگ جن کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ مقدر کردی گئی ہے وہ اس جہنم سے دُور کئے جائیں گے۔

اس کا حاصل ظاہر ہے کہ سب ہی صحابہ کرامؓ کے حق میں یہ فیصلہ فرمادیا کہ وہ جہنم سے دُور رکھے جاویں گے۔

نیز سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:-

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ

اَتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ، اِنَّهٗ بِهِمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار کی توبہ قبول فرمائی جنھوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی پیروی کی، بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک فریق کے دِل کج ہوجائیں، پھر اللہ نے ان کو معاف کردیا، بلاشبہ وہ ان پر بہت مہربان رحمت کرنے والا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کی ضمانت دے دی کہ حضراتِ صحابہؓ سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، توبہ کرلے گا، یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و نصرت اور دین کی خدماتِ عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کردے گا، اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہوکر وہ صاف بے باق ہوجائیں، اسی لئے ان میں سے کسی بھی صحابی کو ساقط العدالۃ یا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ صدورِ گناہ کے وقت اس پر تمام وہی اَحکام نافذ ہوں گے جو دُوسرے مسلمانوں پر ہوتے، حدِ شرعی یا تعزیری سزائیں جو عام مسلمانوں کے لئے ہیں وہ ان پر جاری کی جائیں گی، اور صدورِ گناہ کے وقت اس عمل کو فسق بھی کہا جائے گا، جیسا کہ آیت: "وَاِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ" سے معلوم ہوتا ہے، مگر چونکہ ان کی توبہ یا معافی بنصِ قرآن معلوم ہوچکی ہے اس لئے ان کو کسی وقت بھی ساقط العدالت فاسق نہ کہا جائے گا، کذا حقّقہ الألوسیؒ فی رُوح المعانی تحت آیة: وَاِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ۔

قاضی ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے آیتِ رضوان کے تحت فرمایا:-

والرضٰی من اللہ صفت قدیمة فلا یرضٰی الا من عبد یعلم أنه یوفّیه علٰی موجباتِ الرضٰی، ومن رضی اللہ عنه

لم یسخط علیه أبدًا. (الصارم المسلول لابن تیمیةؒ)

ترجمہ:- اور اللہ کی خوشنودی، باری تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ صرف اس بندے سے راضی ہوتا ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ رضامندی کے موجبات کا جامع ہے، اور جس سے اللہ راضی ہوجائے اس پر کبھی ناراض نہیں ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کے غیر معصوم ہونے اور سب کے عدول میں جو ایک ظاہری تعارض ہے اس کا جواب جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک یہی ہے اور وہ بالکل واضح اور صاف ہے۔

اور بعض علماء نے جو عدمِ عصمت اور عمومِ عدالت کے تضاد سے بچنے کے لئے ''عدالت'' کے مفہوم میں یہ ترمیم فرمائی کہ یہاں ''عدالت'' سے مراد تمام اوصاف واعمال کی عدالت نہیں بلکہ صرف روایت میں کذب نہ ہونے کی عدالت مراد ہے، یہ لغت وشرع پر ایک زیادتی ہے، جس کی کوئی ضرورت اور کوئی وجہ نہیں، اور ان حضرات کے پیشِ نظر بھی اس ترمیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس کی رُو سے کسی صحابی کو اپنے عمل وکردار کی حیثیت سے ساقط العدالۃ یا فاسق قرار دینا چاہتے ہیں، ان کے کلمات دُوسرے مواقع میں خود اس کی نفی کرتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک مضمون حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ کی طرف ان کے فتاویٰ کے حوالے سے منسوب کیا گیا ہے، یہ مضمون کی وجہ سے ایسا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ جیسے جامعِ علوم بزرگ کی طرف اس کی نسبت کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی، اور ''فتاویٰ عزیزی'' کے نام سے جو مجموعہ شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہ خود ان کو جمع فرمایا ہے، نہ ان کی زندگی میں وہ شائع ہوا ہے، وفات کے معلوم نہیں کتنے عرصہ بعد مختلف لوگوں کے پاس جو ان کے خطوط وفتاویٰ دُنیا میں پھیلے ہوئے تھے ان کو جمع کرکے یہ مجموعہ شائع

ہوا ہے، اس میں بہت سے احتمالات ہو سکتے ہیں کہ کسی نے کوئی تدلیس اس میں کی ہو اور غلط بات ان کی طرف منسوب کرنے کے لئے فتاویٰ کے مجموعے میں شامل کر دیا ہو، اور اگر بالفرض یہ واقعی حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ ہی کا قول ہے تو وہ بھی بمقابلہ جمہور علماء وفقہاء کے متروک ہے۔ (واللہ اعلم)

علمِ عقائد و کلام کی تقریباً سبھی کتابوں میں، اسی طرح اُصولِ حدیث کی سب کتابوں میں اس پر اِجماع نقل کیا گیا ہے، جس میں سے چند کے حوالے اس جگہ نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲:- حدیث اور اُصولِ حدیث کے امام ابنِ صلاح رحمہ اللہ "علوم الحدیث" میں تحریر فرماتے ہیں:-

> للصحابة بأسرهم خصيصة وهي أنه لا يسأل عن عدالة أحد منهم بل ذٰلک أمر مفروغ عنه لكونهم على الاطلاق معدلين بنصوص الكتاب والسنة واجماع من يعتد به في الاجماع من الأمة، قال تعالىٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. قيل: اتفق المفسرون علىٰ أنه وارد في أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم (ثم سرد بعض النصوص القرآنية والأحاديث كما ذكرنا سابقًا).

(علوم الحدیث ص:۲۶۴)

ترجمہ:- تمام صحابہ کرامؓ کی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت (ثقہ ومتقی) ہونے کا سوال بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے، قرآن و سنت کی نصوصِ قطعیہ اور اِجماعِ اُمت جن لوگوں کا معتبر ہے، ان کے اِجماع سے ثابت ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم بہترین اُمت

ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ:
مفسرین حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت اصحابِ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آئی ہے۔

۳:- حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے مقدمہ ''استیعاب'' میں فرمایا:-

فهم خير القرون وخير أمة أخرجت للناس ثبتت عدالة جميعهم بثناء الله عزّ وجلّ عليهم وثناء رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا أعدل ممن ارتضاه الله بصحبة نبيه صلى الله عليه وسلم ونصرته ولا تزكية أفضل من ذٰلک ولا تعديل أكمل منها، قال تعالٰى: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ. الأية. (الاستیعاب تحت الاصابۃ ج:۱ ص:۲)

ترجمہ:- یہ حضراتِ صحابہؓ ہر زمانے کے افراد سے افضل ہیں، اور وہ بہترین اُمت ہیں جسے اللہ نے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے پیدا فرمایا، ان سب کی عدالت اس طرح ثابت ہے کہ اللہ نے بھی ان کی تعریف و توصیف فرمائی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، اور ان لوگوں سے بڑھ کر کون عادل ہوسکتا ہے جنھیں اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور نصرت کے لئے چن لیا ہو، کسی شخص کے حق میں عدالت و ثقاہت کی، کوئی اس شہادت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی۔

امام احمد رحمہ اللہ کا اپنا ایک رسالہ اصطخری کی روایت سے منقول ہے، اس میں فرمایا:-

لا يجوز لأحد أن يذكر شيئًا من مساويهم ولا أن يعطن علٰى أحد منهم بعيب ولا نقص فمن فعل ذٰلک وجب

تأديبه. وقال الميموني: سمعت أحمد يقول: ما لهم ولمعاوية نسأل الله العافية. وقال لي: يا أبا الحسن! اذا رأيت أحدًا يذكر أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بسوء فاتهمه على الاسلام.

(ذكره ابن تيمية في الصارم المسلول)

ترجمہ:- کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ ان کی کوئی بُرائی ذکر کرے، اور ان پر کسی عیب یا نقص کا الزام لگائے، جو شخص ایسا کرے اس کی تأدیب واجب ہے۔ اور میمونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بُرائی کرتے ہیں، ہم اللہ سے عافیت کے طلب گار ہیں، اور پھر مجھ سے فرمایا کہ: جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہؓ کا ذکر بُرائی کے ساتھ کر رہا ہے اس کے اسلام کو مشکوک سمجھو۔

۵:- امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "تقریب" میں فرمایا:-

الصحابة كلّهم عدول من لابس الفتن وغيرهم باجماع من يعتد به.

ترجمہ:- صحابہؓ سب کے سب عدل ہیں، جو اختلافات کے فتنے میں مبتلا ہوئے وہ بھی اور دُوسرے بھی۔

۶:- علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اسی "تقریب" کی شرح "تدریب الراوی" میں پہلے اس کے ثبوت میں وہ آیاتِ قرآنی اور روایاتِ حدیث لکھی ہیں جن کا ایک حصہ اُوپر لکھا جاچکا ہے، پھر فرمایا:-

ان سب حضرات کا تعدیل وتنقید سے بالاتر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ

حضرات حاملانِ شریعت ہیں، اگر ان کی عدالت مشکوک ہوجائے تو شریعتِ محمدیہؐ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی تک محدود ہوکر رہ جائے گی، قیامت تک آنے والی نسلوں اور دُور دراز کے ملکوں اور خطوں میں عام نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد جن بعض لوگوں نے اس مسئلے میں کچھ اختلافی پہلو لکھا ہے، ان پر رَدّ کرکے آخر میں فرمایا:-

والقول بالتعميم هو الذى صرح به الجمهور وهو المعتبر. (تدریب الراوی ص:۴۰۰)

ترجمہ:- عدالت کا تمام صحابہ کرامؓ میں عام ہونا ہی جمہور کا قول ہے، اور وہی معتبر ہے۔

۷:- علامہ کمال ابنِ ہمام رحمہ اللہ نے عقائدِ اسلامیہ پر اپنی جامع کتاب ''مسایرہ'' میں لکھا ہے:-

واعتقاد أهل السنة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوبًا باثبات العدالة لكل منهم والكف عن الطعن فيهم والثناء عليهم كما اثنى الله سبحانه وتعالىٰ عليهم.

(ثم سرد الأيات والروايات اللتي مرّت).

(مسایرہ ص:۱۳۲ طبع دیوبند)

ترجمہ:- عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا تمام صحابہ کرامؓ کا تزکیہ یعنی گناہوں سے پاکی بیان کرنا ہے، اس طرح کہ ان سب کے عدول ہونے کو ثابت کیا جائے اور ان پر کسی قسم کا طعن کرنے سے پرہیز کیا جائے اور ان کی مدح وثنا کی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے۔ (پھر ابنِ ہمام رحمہ اللہ نے وہ آیات وروایات نقل کی ہیں جو اُوپر گزر چکی ہیں)۔

۸:- حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے "شرح عقیدة واسطیة" میں فرمایا:-

ومن أصول أهل السنة والجماعة سلامة قلوبهم وألسنتهم لأصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كما وصفهم الله تعالىٰ فى قوله تعالىٰ: وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ. الأية. (شرح عقیدہ واسطیہ ص:۴۰۳ طبع مصر)

ترجمہ:- اہلِ سنت کے اُصولِ عقائد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اپنے دِلوں اور زبانوں کو صحابہؓ کے معاملے میں صاف رکھتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ.... الخ۔

۹:- علامہ سفارینی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الدرة المضية" اور اس کی شرح جو سلف صالحین کے عقائد پر تصنیف فرمائی ہے، اور "لوامع الأنوار البهية شرح الدرة المضية" کے نام سے شائع ہوئی، اس میں فرماتے ہیں:-

والذى أجمع عليه أهل السنة والجماعة أنه يجب علىٰ كل أحد تزكية جميع الصحابة باثبات العدالة لهم والكف عن الطعن فيهم والثناء عليهم فقد أثنى الله سبحانه عليهم فى عدة اٰيات من كتابه العزيز علىٰ انه لو لم يرد عن الله ولا عن رسوله فيهم شىء لأوجبت الحال التى كانوا عليها من الهجرة والجهاد ونصرة الدين وبذل المهج والأموال وقتل الأباء والأولاد والمناصحة فى الدين وقوة الايمان واليقين القطع بتعديلهم والاعتقاد لنزاهتهم وانهم أفضل جميع الأمة بعد نبيهم، هٰذا مذهب كافة الأمة ومن عليه المعوّل من الأئمة. (عقیدہ سفارینیؒ ج:۲ ص:۳۳۸)

ترجمہ:- اہلِ سنت والجماعت کا اس پر اِجماع ہے کہ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ تمام صحابہؓ کو پاک صاف سمجھے، ان کے لئے عدالت ثابت کرے، ان پر اعتراضات کرنے سے بچے، اور ان کی مدح وتوصیف کرے، اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز کی متعدّد آیت میں ان کی مدح وثنا کی ہے، اس کے علاوہ اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ کی فضیلت میں کوئی بات منقول نہ ہوتی تب بھی ان کی عدالت پر یقین اور پاکیزگی کا اعتقاد رکھنا، اور اس بات پر ایمان رکھنا ضروری ہوتا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساری اُمت کے افضل ترین افراد ہیں، اس لئے ان کے تمام حالات اسی کے مقتضی تھے، انہوں نے ہجرت کی، جہاد کیا، دین کی نصرت میں اپنی جان و مال کو قربان کیا، اپنے باپ بیٹوں کی قربانی پیش کی، اور دین کے معاملے میں باہمی خیرخواہی اور ایمان ویقین کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔

۱۰:- اسی کتاب میں امام ابوزرعہ عراقی رحمہ اللہ جو امام مسلم رحمہ اللہ کے بڑے اساتذہ میں سے ہیں، ان کا یہ قول نقل کیا ہے:-

اذا رأيت الرجل ينتقص أحدًا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاعلم انه زنديق وذلك ان القراٰن حق والرسولُ حق وما جاء به حق، وما أدّىٰ ذٰلك الينا كل الا الصحابة، فمن جرحهم انما أراد ابطال الكتاب والسنة فيكون الجرح به اليق والحكم عليه بالزندقة

والضلال أقوم وأحق. (ج:۲ ص:۳۸۹)

ترجمہ:- جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کی بھی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے، اس لئے کہ قرآن حق ہے، رسولؐ حق ہیں، جو تعلیمات آپؐ لے کر آئے وہ حق ہیں، اور یہ سب چیزیں ہم تک پہنچانے والے صحابہؓ کے سوا کوئی نہیں، تو جو شخص ان کو مجروح کرتا ہے، وہ کتاب وسنت کو باطل کرنا چاہتا ہے، لہٰذا خود اس کو مجروح کرنا زیادہ مناسب ہے، اور اس پر گمراہی اور زندقہ کا حکم لگانا زیادہ قرینِ حق و انصاف ہے۔

۱۱:- اسی کتاب میں حافظِ حدیث ابنِ حزم اندلسی رحمہ اللہ سے اس مسئلے میں یہ قول نقل کیا ہے:-

قال ابن حزم: الصحابة كلّهم من أهل الجنة قطعًا، قال تعالٰى: لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى. وقال تعالٰى: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى أُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ. (ص:۳۸۹)

ترجمہ:- علامہ ابنِ حزمؒ فرماتے ہیں کہ: تمام صحابہؓ قطعی طور پر اہلِ جنت میں سے ہیں، (دلیل یہ ہے کہ) باری تعالیٰ فرماتے ہیں: تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا وہ (بعد کے لوگوں کے) برابر نہیں ہوسکتے، وہ لوگ درجے کے اعتبار سے ان لوگوں کے مقابلے میں عظیم تر ہیں جنھوں نے (فتحِ مکہ کے) بعد اِنفاق اور قتال

کیا، اور اللہ نے اچھائی (جنت) کا وعدہ سبھی سے کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے ہمارا اچھائی (جنت) کا وعدہ پہلے سے آچکا ہے وہ دوزخ سے دُور رکھے جائیں گے۔

۱۲:- عقائد کی مشہور درسی کتاب ''عقائدِ نسفیہ'' میں ہے:-

ویکف عن ذکر الصحابة الّا بخیر.

یعنی اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا ذکر بجز خیر اور بھلائی کے نہ کرے۔

۱۳:- اسی طرح عقائدِ اسلامیہ کی معروف کتاب ''شرحِ مواقف'' میں سیّد شریف جرجانی رحمہ اللہ نے مقصد سابع میں لکھا ہے:-

المقصد السابع انه یجب تعظیم الصحابة کلّهم والکف عن القدح فیهم لأن الله عظیم وأثنی علیهم فی غیر موضع من کتابه (ثم ذکر الأیات المنزلة فی الباب، ثم قال:) والرسول صلی الله علیه وسلم قد أحبهم وأثنی علیهم فی الأحادیث الکثیرة.

ترجمہ:- تمام صحابہؓ کی تعظیم اور ان پر اعتراض سے بچنا واجب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عظیم ہے اور اس نے ان حضرات پر اپنی کتاب کے بہت سے مقامات میں مدح و ثنا فرمائی ہے، (اس طرح کی آیات نقل کرکے لکھتے ہیں:) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات سے محبت فرماتے تھے اور آپؐ نے بہت سی احادیث میں ان پر ثنا فرمائی ہے۔

ان ہی شارحِ مواقف نے ایک مقام پر بعض اہلِ سنت کی طرف نسبت

کرکے یہ قول ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت علیؓ سے جنگ کرنے والوں کی خطا تفسیق کی حد تک پہنچتی ہے، لیکن شارحِ مواقف کے اس قول کی کوئی بنیاد ہمیں معلوم نہیں ہوسکی، اہلِ سنت کے کسی ایک عالم کے کلام میں بھی ہمیں یہ بات نظر نہیں آئی کہ انہوں نے اس بناء پر حضرت عائشہ یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو فاسق قرار دیا ہو، چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مکتوبات'' میں شارحِ مواقف کے اس قول کی سخت تردید کی ہے، حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وآنچہ شارح مواقف گفتہ کہ بسیارے از اصحاب ما برآں اند کہ آں منازعت از روئے اجتہاد نبودہ مراد از اصحاب کدام گروہ را داشتہ باشد، اہلِ سنت برخلاف آں حاکم اند چنانکہ گذشت وكتب القوم مشحونة بالخطاء الاجتهاديّ كما صرّح به الامام الغزالي والقاضي أبوبكر وغيرهما۔ پس تفسیق و تضلیل درحق محاربان حضرت امیر جائز نباشد۔ قال القاضي في الشفاء: قال مالك: من شتم أحدًا من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم أبا بكر أو عمر أو عثمان أو معاوية أو عمرو بن العاص رضي الله تعالٰى عنهم فان قال: كانوا علٰى ضلالٍ أو كفرٍ، قتل، وان شتم بغير هذا من مشاعة الناس نُكِلَ نكالًا شديدًا، فلا يكون محاربوا عليٍّ كفرةً كما زعمت الغلاة من الرفضة ولا فسقةً كما زعم البعض ونسبهٗ شارح المواقف الٰى كثير من أصحابه ..... وآنچہ در عبارات بعضی از فقہاء لفظِ جور درحق معاویہؓ واقع شدہ است وگفتہ: كان معاوية امامًا جائرًا، مراد از جور عدم حقیقت خلافت او در زمان خلافت حضرت امیر خواہد بود نہ جورے کہ مآلش فسق و ضلالت است

تا بہ اقوال اہلِ سنت موافق باشد، مع ذالک اربابِ استقامت از اتیان الفاظ موہمہ خلافِ مقصود اجتناب می نمایند و زیادہ برخطا تجویز نمی کنند۔

(مکتوبات امامِ ربانی دفترِ اوّل حصہ چہارم مکتوب نمبر ۲۵۱ ص: ۶۷ تا ۶۹ جلد دوم، مطبوعہ نور کمپنی لاہور)

ترجمہ:- اور یہ جو شارحِ مواقف نے کہا ہے کہ ہمارے بہت سے اصحاب اس مسلک پر ہیں کہ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ اجتہاد پر مبنی نہیں تھی، اس میں نہ جانے "اصحاب" سے کون سا گروہ مراد لیا ہے، اہلِ سنت کا عقیدہ تو اس کے خلاف ہے، جیسا کہ گزر چکا، اور علمائے اہلِ سنت کی کتابیں خطاءِ اجتہادی کی تصریح سے بھری ہوئی ہیں، جیسے کہ امام غزالیؒ اور قاضی ابوبکر بن عربیؒ وغیرہ نے بہ صراحت لکھا ہے۔ لہٰذا حضرت علیؓ سے جن حضرات نے جنگ کی انہیں فاسق یا گمراہ کہنا جائز نہیں ہے۔ قاضی عیاضؒ نے "شفاء" میں امام مالکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: جو شخص صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بھی خواہ وہ ابوبکر و عمر یا عثمان ہوں یا معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم، برا کہے تو اگر یہ کہے کہ: "وہ گمراہی یا کفر پر تھے" تو اسے قتل کیا جائے گا، اور اگر اس کے علاوہ عام گالیوں میں سے کوئی گالی دے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔ لہٰذا امام مالکؒ کے اس قول کی رُو سے بھی حضرت علیؓ کا مقابلہ کرنے والے نہ تو کافر ہیں جیسے کہ بعض غالی روافض کا خیال ہے، اور نہ فاسق ہیں جیسے کہ بعض کا گمان ہے۔ اور شارحِ مواقف نے اس کی نسبت اپنے بہت سے اصحاب کی

طرف کی ہے، اور یہ جو بعض فقہاء کی عبارتوں میں حضرت معاویہؓ کے حق میں ''جور'' کا لفظ آگیا ہے، اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ: ''حضرت معاویہؓ امامِ جائر تھے'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں ان کی خلافت برحق نہ تھی، اس سے وہ ظلم و جور مراد نہیں ہے جس کا نتیجہ فسق اور گمراہی ہے، یہ تشریح اس لئے ضروری ہے تاکہ اہلِ سنت کے اقوال کے ساتھ موافقت ہوجائے۔ اس کے ساتھ دین پر استقامت رکھنے والے ان حضرات کے حق میں ایسے الفاظ سے بھی پرہیز کرتے ہیں جن سے خلافِ مقصود کا وہم پیدا ہوتا ہو، اور ان حضرات کے لئے ''خطاء'' کے لفظ سے زیادہ کوئی لفظ کہنا جائز نہیں سمجھتے۔

❁❁❁

مشاجراتِ صحابہؓ کے معاملے میں اُمت کا عقیدہ اور عمل

لفظِ ''مشاجرہ'' شجر سے مشتق ہے، جس کے اصل معنے تنے دار درخت کے ہیں جس کی شاخیں اطراف میں پھیلتی ہیں، باہمی اختلافاتِ و نزاع کو اسی مناسبت سے مشاجرہ کہا جاتا ہے کہ درخت کی شاخیں بھی ایک دُوسرے سے ٹکراتی اور ایک دُوسرے کی طرف بڑھتی ہیں۔ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان جو اختلافات پیش آئے اور کھلی جنگوں تک نوبت پہنچ گئی، علمائے اُمت نے ان کی باہمی حروب اور اختلافات کو جنگ و جدال سے تعبیر نہیں کیا، بلکہ از رُوئے ادب ''مشاجرہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ درخت کی شاخوں کا ایک دُوسرے میں گھسنا اور ٹکرانا مجموعی حیثیت سے کوئی عیب نہیں، بلکہ درخت کی زینت اور کمال ہے۔

ایک سوال اور جواب

اسلام میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا درجہ اور مقام جو اُوپر قرآن و سنت کی نصوص اور اِجماعِ اُمت اور اکابر علماء کی تصریحات سے ثابت ہوچکا ہے، اس کے بعد ایک قدرتی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب صحابہ کرامؓ سب کے سب واجب التعظیم اور عدل و ثقہ و متقی و پرہیزگار ہیں تو اگر ان کے آپس میں کسی مسئلے میں اختلاف پیش آجائے تو ہمارے لئے طریقِ کار کیا ہونا چاہئے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ دو متضاد اقوال میں دونوں کو صحیح سمجھ کر دونوں ہی کو معمول نہیں بنایا جاسکتا، عمل کرنے کے لئے کسی ایک

کو اختیار کرنا دُوسرے کو چھوڑنا لازم ہے تو اس ترک و اختیار کا معیار کیا ہونا چاہئے؟ نیز اس میں دونوں طرف کے بزرگوں کا ادب و احترام اور تعظیم کیسے قائم رہے گی جبکہ ایک کے قول کو مرجوح قرار دے کر چھوڑا جائے گا؟

خصوصاً یہ سوال ان معاملات میں زیادہ سنگین ہوجاتا ہے جن میں ان حضرات کا اختلاف باہمی جنگ و خون ریزی تک پہنچ گیا، ان میں ظاہر ہے کہ کوئی ایک فریق حق پر ہے، دُوسرا خطاء پر، اس خطاء وصواب کے معاملے کو طے کرنا عمل و عقیدہ کے لئے ضروری ہے، مگر اس صورت میں دونوں فریق کی یکساں تعظیم و احترام کیسے قائم رکھا جاسکتا ہے؟ جس کو خطاء پر قرار دیا جائے اس کی تنقیص ایک لازم امر ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ دو مختلف اقوال میں سے ایک کو حق یا راجح اور دُوسرے کو خطاء یا مرجوح قرار دینے میں کسی ایک فریق کی تنقیص لازم ہے۔ اسلافِ اُمت نے ان دونوں کاموں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ عمل اور عقیدہ کے لئے کسی ایک فریق کے قول کو شریعت کے مُسلّمہ اُصولِ اجتہاد کے مطابق اختیار اور دُوسرے کو ترک کیا، لیکن جس کے قول کو ترک کیا ہے اس کی ذات اور شخصیت کے متعلق کوئی ایک جملہ بھی ایسا نہیں کہا جس سے ان کی تنقیص ہوتی ہو، خصوصاً مشاجراتِ صحابہؓ میں تو جس طرح اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ دونوں فریق کی تعظیم واجب اور دونوں فریق میں سے کسی کو بُرا کہنا ناجائز ہے، اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ جنگِ جمل میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ حق پر تھے، ان کا مقابلہ کرنے والے خطاء پر تھے، اسی طرح جنگِ صفین میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ حق پر تھے اور ان کے مقابل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب خطاء پر، البتہ ان کی خطاؤں کو اجتہادی خطاء قرار دیا جو شرعاً گناہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہو، بلکہ اُصولِ اجتہاد کے مطابق اپنی کوشش صَرف کرنے کے بعد بھی اگر ان سے خطاء ہوگئی تو ایسے خطاء کرنے والے بھی ثواب سے محروم نہیں ہوتے، ایک اَجر ان کو بھی ملتا ہے۔

باجماعِ اُمت ان حضراتِ صحابہؓ کے اس اختلاف کو بھی اسی طرح کا اجتہادی اختلاف قرار دیا گیا ہے جس سے کسی فریق کے حضرات کی شخصیتیں مجروح نہیں ہوتیں۔

اس طرح ایک طرف خطاء وصواب کو بھی واضح کردیا گیا دُوسری طرف صحابہ کرامؓ کے مقام اور درجے کا پورا احترام بھی ملحوظ رکھا گیا، اور مشاجراتِ صحابہؓ میں کفِ لسان اور سکوت کو اَسلم قرار دے کر اس کی تاکید کی گئی کہ بلاوجہ ان روایات و حکایات میں خوض کرنا جائز نہیں جو باہمی جنگ کے دوران ایک دُوسرے کے متعلق نقل کی گئی ہیں، ملاحظہ ہوں مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں سلف صالحین کے اقوالِ ذیل:-

۱۴:- تفسیرِ قرطبی سورۂ حجرات میں آیت: "وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا" کے تحت مشاجراتِ صحابہؓ پر سلف صالحین کے اقوال کے ساتھ بہترین تحقیق فرمائی ہے جو انہیں کی طویل عبارت میں لکھی جاتی ہے:-

العاشرة: لا يجوز أن ينسب الٰى أحد من الصحابة خطاء مقطوع به اذ كانوا كلّهم اجتهدوا فيما فعلوه وأرادوا الله عزّ وجلّ، وهم كلّهم لنا أئمة وقد تعبدنا بالكف عما شجر بينهم، ولا نذكرهم الا بأحسن الذكر، لحرمة الصحبة ولنهى النبى صلى الله عليه وسلم عن سبّهم، وان الله غفر لهم وأخبر بالرضاء عنهم، هٰذا مع ما قد ورد من الأخبار من طرق مختلفة عن النبى صلى الله عليه وسلم ان طلحة شهيد يمشى علٰى وجه الأرض، فلو كان ما خرج اليه من الحرب عصيانًا لم يكن القتل فيه شهيدًا، وكذٰلک لو كان ما خرج اليه خطاء فى التأويل وتقصيرًا فى الواجب عليه، لأن الشهادة لا تكون الا بقتل فى طاعة، فوجب حمل أمرهم علٰى ما

بيّناه. ومما يدل علٰى ذٰلك ما قد صح وانتشر من أخبار علىّ بأن قاتل الزبير فى النار، وقوله: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: بشر قاتل ابن صفية بالنار. واذا كان كذٰلك فقد ثبت أن طلحة والزبير غير عاصيين ولا اٰثمين بالقتال، لأن ذٰلك لو كان كذٰلك لم يقل النبى صلى الله عليه وسلم فى طلحة: شهيد. ولم يخبر أن قاتل الزبير فى النار. وكذٰلك من قعد غير مخطئ فى التأويل، بل صواب أراهم الله الاجتهاد، واذا كان كذٰلك لم يوجب ذٰلك لعنهم والبراءة منهم وتفسيقهم وابطال فضائلهم وجهادهم، وعظيم غنائهم فى الدين رضى الله عنهم. وقد سئل بعضهم عن الدماء التى اريقت فيما بينهم فقال: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. وسئل بعضهم عنها أيضًا فقال: تلك دماء قد طهر الله منها يدى، فلا أخضب بها لسانى. يعنى فى التحرز من الوقوع فى خطاء والحكم علٰى بعضهم بما لا يكون مصيبًا فيه. قال ابن فورك: ومن أصحابنا من قال ان سبيل ما جرت بين الصحابة من المنازعات كسبيل ما جرى بين أخوة يوسف مع يوسف، ثم انهم لم يخرجوا بذٰلك عن حدّ الولاية والنبوة فكذٰلك الأمر فيما جرى بين الصحابة. وقال المحاسبى: فأما الدماء فقد أشكل علينا القول

فيهـا بـاختلافهم. وقد سئل الحسن البصري عن قتالهم فـقال: قتال شهده أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم وغبنـا، وعـلـموا وجهلنا، واجتمعوا فاتبعنا، واختلفوا فـوقـفنا. قال المحاسبي: فنحن نقول كما قال الحسن. ونـعـلـم ان القوم كانوا أعلم بما دخلوا فيه منّا، ونتبع ما اجتمعوا عليه، ونقف عند ما اختلفوا فيه، ولا نبتدع رأيا منّـا، ونعلم أنّهم اجتهدوا وأرادوا الله عزّ وجلّ اذ كانوا غير متهمين في الدين، ونسأل الله التوفيق.

(تفسیرِ قرطبی ج:۱٦ ص:۳۲۲)

ترجمہ:- یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے، اس لئے کہ ان سب حضراتؓ نے اپنے اپنے طرزِ عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضراتؓ ہمارے پیشوا ہیں، اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کفِ لسان کریں، اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں، کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے انہیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے، اس کے علاوہ متعدّد سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہؓ کے بارے میں فرمایا:-

ان طلحة شهيد يمشي على وجه الأرض.

یعنی طلحہؓ رُوئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں۔

اب اگر حضرت علیؓ کے خلاف حضرت طلحہؓ کا جنگ کے لئے نکلنا کھلا گناہ اور عصیان تھا تو اس جنگ میں مقتول ہوکر وہ ہرگز شہادت کا رُتبہ حاصل نہ کرتے، اسی طرح اگر حضرت طلحہؓ کا یہ عمل تأویل کی غلطی اور ادائے واجب میں کوتاہی قرار دیا جاسکتا تو بھی آپ کو شہادت کا مقام حاصل نہ ہوتا کیونکہ شہادت تو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اطاعتِ ربانی میں قتل ہوا ہو، لہٰذا ان حضرات کے معاملے کو اسی عقیدے پر محمول کرنا ضروری ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا۔

اسی بات کی دُوسری دلیل وہ صحیح اور معروف و مشہور احادیث ہیں جو خود حضرت علیؓ سے مروی ہیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''زبیر کا قاتل جہنم میں ہے۔''

نیز حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''صفیہؓ کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی خبر دے دو'' جب یہ بات ہے تو ثابت ہوگیا کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اس لڑائی کی وجہ سے عاصی اور گنہگار نہیں ہوئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت طلحہؓ کو ''شہید'' نہ فرماتے، اور حضرت زبیرؓ کے قاتل کے بارے میں جہنم کی پیشن گوئی نہ کرتے۔ نیز ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے، جن کے جنتی ہونے کی شہادت تقریباً متواتر ہے۔

اسی طرح جو حضراتِ صحابہؓ ان جنگوں میں کنارہ کش رہے، انہیں بھی تأویل میں خطاکار نہیں کہا جاسکتا، بلکہ ان کا طرزِ عمل بھی اس لحاظ سے دُرست تھا کہ اللہ نے ان کو اجتہاد میں اسی رائے پر

قائم رکھا۔ جب یہ بات ہے تو اس وجہ سے ان حضرات پر لعن طعن کرنا، ان سے براءۃ کا اظہار کرنا اور انہیں فاسق قرار دینا، اُن کے فضائل و مجاہدات اور ان کے عظیم دینی مقامات کو کالعدم کردینا کسی طرح دُرست نہیں ہے۔ بعض علماء سے پوچھا گیا کہ اس خون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو صحابہ کرامؓ کے باہمی مشاجرات میں بہایا گیا؟ تو انہوں نے جواب میں یہ آیت پڑھ دی کہ:۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ.

ترجمہ:۔ یہ ایک اُمت تھی جو گزر گئی، اس کے اعمال اس کے لئے ہیں، اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

کسی اور بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا:۔
یہ ایسے خون ہیں کہ اللہ نے میرے ہاتھوں کو اس میں (رنگنے سے) بچایا، اب میں اپنی زبان کو ان سے آلودہ نہیں کروں گا۔ مطلب یہی تھا کہ میں کسی ایک فریق کو کسی معاملے میں یقینی طور پر خطا کار ٹھہرانے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔

علامہ ابن فورکؒ فرماتے ہیں:۔
ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی، وہ حضرات آپس کے ان اختلافات کے باوجود ولایت اور

نبوّت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے، بالکل یہی معاملہ صحابہؓ کے درمیان پیش آنے والے واقعات کا بھی ہے۔

اور حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں:-

جہاں تک اس خونریزی کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف تھا۔ اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کے باہمی قتال کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ:-

یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے، ہم نہیں جانتے، جس معاملے پر تمام صحابہؓ کا اتفاق ہے، ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جس معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہے، اس میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔

حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ: ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے فرمائی، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جن چیزوں میں دخل دیا، ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے، لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں، اور جس میں ان کا اختلاف ہو، اس میں خاموشی اختیار کریں، اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا، اور اللہ کی خوشنودی چاہی تھی، اس لئے کہ دین کے معاملے میں وہ سب حضرات شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔

اس طویل عبارت میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ سنت کے عقیدے

کی بہترین ترجمانی فرمائی ہے، عبارت کے شروع میں انہوں نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت سے متعلق جو حدیثیں نقل فرمائی ہیں، ان سے اس مسئلے پر بطورِ خاص روشنی پڑتی ہے، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ دونوں حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ میں سے ہیں، اور ان دس خوش نصیب حضرات میں آپ کا نام بھی ہے جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر ان کے جنتی ہونے کی خوشخبری دی ہے، اور جنہیں ''عشرۂ مبشرہ'' کہا جاتا ہے، ان دونوں حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کیا اور اسی دوران شہید ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ احادیث میں ان دونوں حضرات کو شہید قرار دیا۔ دُوسری طرف حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سرگرم ساتھیوں میں سے تھے اور انہوں نے پوری قوّت کے ساتھ حضرت علیؓ کے مخالفین کا مقابلہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے بھی شہادت کی پیش گوئی فرمائی، غور کیا جائے تو یہی ارشادات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان جنگوں میں کوئی فریق بھی کھلے باطل پر نہ تھا، بلکہ ہر ایک فریق اللہ کی رضا کے لئے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق کام کر رہا تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اختلاف کھلے حق و باطل کا اختلاف ہوتا تو ہر ایک فریق کے رہنماؤں کے لئے بیک وقت شہادت کی پیش گوئی نہ فرمائی جاتی، ان ارشادات نے یہ واضح کردیا کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی اللہ کی خوشنودی کے لئے لڑ رہے تھے اس لئے وہ بھی شہید ہیں، اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا مقصد بھی رضائے الٰہی کے حصول کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے وہ بھی لائقِ مدح و ستائش ہیں، دونوں کا اختلاف کسی دُنیوی غرض سے نہیں بلکہ اجتہاد و رائے کی بناء پر تھا اور ان میں سے کسی بھی فریق کو مجروح و مطعون نہیں کیا جاسکتا۔

۱۵:- شرحِ مواقف مقصدِ سابع میں ہے:-

وأمّا الفتن والحروب الواقعة بين الصحابة فالشامية انكروا وقوعها ولا شک انه مکابرة للتواتر فی قتل عثمان وواقعة الجمل والصفین، والمعترفون بوقوعها منهم من سکت عن الکلام فیها بتخطیة أو تصویب وهم طائفة من أهل السنّة فان أرادوا انه اشتغال بما لا یعنی فلا بأس به، وقال الشافعیؒ وغیره من السلف: تلک دماء طهّر الله عنها أیدینا فلنطهّر عنها ألسنتنا .... الخ.

(شرح مواقف ج:۸ ص:۳۷۴ طبع مصر)

ترجمہ:- رہے وہ فتنے اور جنگیں جو صحابہؓ کے درمیان واقع ہوئے تو فرقۂ شامیہ نے تو ان کے وقوع ہی کا انکار کردیا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور واقعۂ جمل و صفین جس تواتر کے ساتھ ثابت ہے، یہ اس کا بے دلیل انکار ہے، اور جن حضرات نے ان کے وقوع کا انکار نہیں کیا ہے ان میں سے بعض نے تو ان واقعات میں مکمل سکوت اختیار کیا اور نہ کسی خاص فریق کی طرف غلطی منسوب کی، نہ حق و صواب، یہ حضرات اہلِ سنت ہی کی ایک جماعت ہیں، اگر ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ایک فضول کام ہے تو ٹھیک ہے، اس لئے کہ امام شافعیؒ وغیرہ علمائے سلف نے فرمایا ہے کہ: یہ ایسے خون ہیں جن سے اللہ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا ہے، اس لئے چاہئے کہ ہم اپنی زبانوں کو بھی ان سے پاک رکھیں۔

۱۶:- شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ''شرحِ مسامرۃ'' میں فرمایا:-

واعتقاد أهل السنة تزکیة جمیع الصحابة رضی الله

عنهم وجوبًا باثبات الله انه لكل منهم والكفّ عن الطّعن فيهم والثّناء عليهم كما أثنىَ الله سبحانه وتعالىٰ، (وذكر اٰيات عديدة ثم قال:) وأثنى عليهم الرسول صلى الله عليه وسلم، (ثم سرد أحاديث الباب، ثم قال:) وما جرى بين معاوية وعلىّ من الحروب كان مبنيًا على الاجتهاد. (شرحِ مسامرہ ص:۱۳۲ طبع دیوبند)

ترجمہ:- اہلِ سنت کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ تمام صحابہؓ کو لازمی طور پر پاک صاف مانتے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے ہر ایک کا تزکیہ فرمایا ہے، نیز ان کے بارے میں اعتراضات کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور ان سب کی مدح وثناء کرتے ہیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ثناء فرمائی۔ (اس بعد چند آیتیں ذکر کر کے فرماتے ہیں:) اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی تعریف فرمائی۔ (پھر کچھ احادیث نقل کر کے لکھتے ہیں) اور حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جو جنگیں ہوئیں وہ اجتہاد پر مبنی تھیں۔

۱۷:- شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے ''شرح عقیدہ واسطیہ'' میں اس بحث پر تفصیلی کلام فرمایا ہے، ان کے چند جملے یہ ہیں، اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ويبرءون من طريقة الروافض الذين يبغضون الصحابة ويسبّونهم، وطريقة النواصب الذين يؤذون أهل البيت بقولٍ لا عملٍ، ويمسكون عما شجر بين الصحابة ويقولون ان هٰذه الأثار المروية فى مساويهم منها ما هو

كذب، ومنها ما قد زيد فيه ونقص وغير وجهه والصحيح منه هم فيه معذرون إمّا مجتهدون مصيبون، وإمّا مجتهدون مخطئون، وهم مع ذٰلک لا يعتقدون أن كل واحد من الصحابة معصوم من كبائر الاثم وصغائره بل يجوز عليهم الذنوب فى الجملة، ولهم من الفضائل والسوابق ما يوجب مغفرة ما يصدر منهم ان صدر حتى أنهم يغفر لهم من السيئات ما لا يغفر لمن بعدهم.

ترجمہ:- اہلِ سنت ان روافض کے طریقے سے براءۃ کرتے ہیں جو صحابہؓ سے بغض رکھتے ہیں اور انہیں بُرا کہتے ہیں، اسی طرح ان ناصبیوں کے طریقے سے بھی براءۃ کرتے ہیں جو اہلِ بیت کو اپنی باتوں سے، نہ کہ عمل سے، تکلیف پہنچاتے ہیں، اور صحابہؓ کے درمیان جو اختلافات ہوئے ان کے بارے میں اہلِ سنت سکوت اختیار کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی بُرائی میں جو روایتیں منقول ہیں ان میں سے بعض تو بالکل جھوٹ ہیں، بعض ایسی ہیں کہ ان میں کمی بیشی کردی گئی ہے، اور ان کا صحیح مفہوم بدل دیا گیا ہے، اور اس قسم کی جو روایتیں بالکل صحیح ہوں، ان میں بھی صحابہؓ معذور ہیں، ان میں سے بعض حضرات اجتہاد سے کام لے کر حق وصواب تک پہنچ گئے، اور بعض نے اجتہاد سے کام لیا، اور اس میں غلطی ہوگئی، اس کے ساتھ ہی اہلِ سنت کا یہ اعتقاد بھی نہیں ہے کہ صحابہؓ کا ہر فرد تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہے، بلکہ ان سے فی الجملہ گناہوں کا صدور ممکن ہے، لیکن ان کے فضائل وسوابق اتنے ہیں کہ اگر کوئی گناہ ان سے

صادر بھی ہو تو یہ فضائل ان کی مغفرت کے موجب ہیں، یہاں تک کہ ان کی مغفرت کے اتنے مواقع ہیں کہ ان کے بعد کسی کو حاصل نہیں ہوسکتے۔

۱۸:- کتابِ مذکور میں ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ ایک مفصل کلام کے بعد لکھتے ہیں:-

اور جب سلف صالحین اہل السنۃ والجماعۃ کا اُصول یہ پڑ گیا جو اُوپر بیان کیا گیا ہے تو اب یہ سمجھئے کہ ان حضرات کے قول کا حاصل یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کی طرف جو بھی گناہ یا بُرائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر حصہ تو جھوٹ اور افتراء ہے، اور کچھ حصہ ایسا ہے جس کو انہوں نے اپنے اجتہاد سے حکمِ شرعی اور دین سمجھ کر اختیار کیا، مگر بہت سے لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ اور حقیقت معلوم نہیں، اس لئے اس کو گناہ قرار دیا۔ اور کسی معاملے میں یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ وہ خطاءِ اجتہادی ہی نہیں بلکہ حقیقۃً گناہ ہی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا وہ گناہ بھی معاف ہوچکا ہے، یا اس وجہ سے کہ انہوں نے توبہ کرلی (جیسا کہ بہت سے ایسے معاملات میں ان کی توبہ خود قرآن و سنت میں منقول و ماثور ہے) اور یا ان کی دُوسری ہزاروں حسنات و طاعات کے سبب معاف کردیا گیا اور یا اس کو دُنیا میں کسی مصیبت و تکلیف میں مبتلا کرنے کے اس گناہ کا کفارہ کردیا گیا، اس کے سوا اور بھی اسباب مغفرت کے ہوسکتے ہیں، (ان کے گناہ کو مغفور و معاف قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ) قرآن و سنت کے دلائل سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں اس لئے ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل ان کے نامۂ اعمال میں

باقی رہے جو جہنم کی سزا کا سبب بنے، اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ صحابہ کرامؓ میں سے کوئی شخص ایسی حالت پر نہیں مرے گا جو دُخولِ جہنم کا سبب بنے تو اس کے سوا اور کوئی چیز ان کے استحقاقِ جنت میں مانع نہیں ہوسکتی۔

اور عشرۂ مبشرہ کے علاوہ کسی معین ذات کے متعلق اگرچہ ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ وہ جنتی ہے، جنت ہی میں جائے گا، مگر یہ بھی تو جائز نہیں کہ ہم کسی کے حق میں بغیر کسی دلیلِ شرعی کے یہ کہنے لگیں کہ وہ مستحق جنت کا نہیں ہے، کیونکہ ایسا کہنا تو عام مسلمانوں میں سے بھی کسی کے لئے جائز نہیں جن کے بارے میں ہمیں کسی دلیل سے جنتی ہونا بھی معلوم نہ ہو، ہم ان کے بارے میں بھی یہ شہادت نہیں دے سکتے کہ وہ ضرور جہنم میں جائے گا، تو پھر افضل المؤمنین اور خیار المؤمنین (صحابہ کرامؓ) کے بارے میں یہ کیسے جائز ہوجائے گا؟ اور ہر صحابی کے پورے اعمالِ ظاہرہ و باطنہ کی اور حسنات و سیئات اور ان کے اجتہادات کی تفصیلات کا علم ہمارے لئے بہت دُشوار ہے اور بغیر علم و تحقیق کے کسی کے متعلق فیصلہ کرنا حرام ہے، اسی لئے مشاجراتِ صحابہؓ کے معاملے میں سکوت کرنا بہتر ہے، اس لئے کہ بغیر علمِ صحیح کے کوئی حکم لگانا حرام ہے۔ (شرح عقیدہ واسطیہ ص:۴۵۶، ۴۵۷)

۱۹:- اس کے بعد شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے صحیح روایت سے یہ واقعہ بیان کیا ہے:-

ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ پر تین الزام لگائے، ایک یہ کہ وہ

غزوۂ اُحد میں میدان سے بھاگنے والوں میں تھے، دُوسرے یہ کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے، تیسرے یہ کہ بیعتِ رضوان میں بھی شریک نہیں تھے۔

حضرت عبداللہؓ نے ان تینوں الزاموں کا جواب یہ دیا کہ: بیشک غزوۂ اُحد میں فرار کا صدور ان سے ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی معافی کا اعلان کردیا، مگر تم نے پھر بھی معاف نہ کیا کہ اس کا ان پر عیب لگاتے ہو۔ رہا غزوۂ بدر میں شریک نہ ہونا تو وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوا اور اسی لئے آپ نے عثمانِ غنیؓ کو غانمینِ بدر میں شمار کرکے ان کا حصہ لگایا، اور بیعتِ رضوان کے وقت وہ حضورؐ ہی کے بھیجے ہوئے مکہ مکرمہ گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بیعت میں شریک کرنے کے لئے خود اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر اپنے دستِ مبارک سے بیعت فرمائی، اور ظاہر ہے کہ خود عثمانِ غنیؓ حاضر ہوتے اور ان کا ہاتھ اس جگہ ہوتا تو بھی وہ فضیلت حاصل نہ ہوتی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک اس سے ہزاروں درجہ بہتر ہے۔

اس واقعے میں غور کرو کہ تین الزاموں میں سے ایک الزام کو صحیح مان کر یہ جواب دیا کہ اب وہ ان کے لئے کوئی عیب نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کردیا ہے، باقی دو الزاموں کا غلط بے اصل ہونا بیان فرمادیا۔ (اس کو نقل کرکے ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ:) یہی حال تمام صحابہؓ کا ہے، ان کی طرف جو کوئی گناہ منسوب کیا جاتا ہے یا تو وہ گناہ ہی نہیں ہوتا بلکہ حسنہ اور نیکی

ہوتی ہے، اور یا پھر وہ اللہ کا معاف کیا ہوا گناہ ہوتا ہے۔

(شرح عقیدہ واسطیہ ص:۴۶۰،۴۶۱)

۲۰:- علامہ سفارینی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الدرة المضية" میں، پھر اس کی شرح میں اس مسئلے پر اچھا کلام کیا ہے، اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، پہلے متنِ کتاب کے دو شعر لکھے ہیں:-

واحذر من الخوض الذی قد یزری

بفضلهم مما جری لو تدری

ترجمہ:- اور پرہیز کرو صحابہ کرامؓ میں پیش آنے والے جھگڑوں میں دخل دینے سے جس میں ان میں سے کسی کی تحقیر ہوتی ہو۔

فانه عن اجتهاد قد صدر

فأسلم ازل الله من لهم هجر

ترجمہ:- کیونکہ ان کا جو عمل بھی ہوا ہے اپنے اجتہادِ شرعی کی بناء پر ہوا ہے، تم سلامتی کی راہ اختیار کرو، اللہ ذلیل کرے اس شخص کو جو ان کی بدگوئی کرے۔

اس کے بعد اس کی شرح میں فرمایا:-

فانه أی التخاصم والنزاع والتقاتل والدفاع الذی جری بینهم کان عن اجتهاد قد صدر من کل واحد من رءوس الفریقین ومقصد سائغ لکل فرقة من الطائفتین وان کان المصیب فی ذلک للصواب وأحدهما وهو علیّ رضوان الله علیه ومن والاه والمخطئ هو من نازعهٗ وعاداهٗ غیر ان للمخطی فی الاجتهاد أجرًا وثوابًا خلافًا لأهل الجفاء والعناد فکل ما صح مما جری بین

الصحابة الكرام وجب حمله علٰى وجه ينفى عنهم الذنوب والأثام فمقاولة علىّ مع العباس رضى الله عنهما لا تفضى الٰى شين، وتقاعد علىّ عن مبايعة الصديق فى بدء الأمر كان لأحد أمرين اما لعدم مشورته كما عتب عليه بذلك واما وقوفًا مع خاطر سيّدة نساء العالم فاطمة البتول مما ظنت أنه لها وليس الأمر كما هنالك ثم ان عليًّا بايع الصديق علٰى رءوس الأشهاد فاتحدت الكلمة ولله الحمد وحصل المراد.

وتوقف علىّ عن الاقتصاص من قتلة عثمان اما لعدم العلم بالقاتل واما خشية تزايد الفساد والطغيان، وكانت عائشة وطلحة والزبير ومعاوية رضى الله عنهم ومن اتبعهم ما بين مجتهد ومقلد فى جواز محاربة أمير المؤمنين سيّدنا أبى الحسنين الا نزع البطين رضوان الله تعالٰى عليه.

وقد اتفق أهل الحق أن المصيّب فى تلك الحروب والتنازع أمير المؤمنين علىّ من غير شك ولا تدافع والحق الذى ليس عنه نزول انهم كلّهم رضوان الله عليهم عدول، لأنهم متأولون فى تلك المخاصمات مجتهدون فى هاتيك المقاتلات فانه وان كان الحق على المعتمد عند أهل الحق واحدًا فالمخطئ مع بذل الوسع وعدم التقصير مأجور لا مأزور وسبب تلك الحروب اشتباه القضايا فلشدة اشتباهها اختلف

اجتهادهم وصاروا ثلاثة أقسام، قسم ظهر لهم اجتهاد ان الحق فى هٰذا الطرف وان مخالفه باغ فوجب عليه نصرة المحق وقتال الباغى عليه فيما اعتقدوه، ففعلوا ذٰلك ولم يكن لمن هٰذا صفته التأخر عن مساعدة الامام العادل فى قتال البغاة فى اعتقاد. وقسم عكسه سواء بسواء. وقسم ثالث اشتبهت عليهم القضية فلم يظهر لهم ترجيح أحد الطرفين فاعتزلوا الفريقين وكان هٰذا الاعتزال هو الواجب فى حقهم لأنه لا يحل الاقدام علىٰ قتال مسلم حتىٰ يظهر ما يوجب ذٰلك. وبالجملة فكلهم معذورون ومأجورون لا مأزورون ولهٰذا اتفق أهل الحق ممن يعتد به فى الاجماع علىٰ قبول شهاداتهم ورواياتهم وثبوت عدالتهم، ولهٰذا كان علمائنا لغيرهم من أهل السُّنّة ومنهم ابن حمدان فى نهاية المبتدئين يجب حب كل الصحابة والكف عما جرىٰ بينهم كتابة وقراءة واقراء واسماع وتسميعا ويجب ذكر محاسنهم والترضى عنهم والمحبة لهم وترك التحامل عليهم واعتقاد العذر لهم وانهم انما فعلوا ما فعلوا باجتهادهم سائغ لا يوجب كفرًا ولا فسقًا بل وربما يتابون عليه لأنه اجتهاد سائغ ثم قتال، وقيل: المصيب عليٌّ رضى الله عنه، ومن قاتله فخطاءه معفوٌّ عنه، وانما نهى عن الخوض فى النظم (أى فى نظم العقيدة عن الخوض فى مشاجرات الصحابة) لأن

الامام أحمد كان ينكر علىٰ من خاض ويسلم أحاديث الفضائل وقد تبرأ ممن ضلّلهم أو كفّرهم وقال: السكوت عما جرى بينهم.

(شرح عقائد سفارینیؒ ج:۲ ص:۳۸۶)

ترجمہ:- اس لئے کہ جو نزاع و جدال اور دفاع و قتال صحابہؓ کے درمیان پیش آیا وہ اس اجتہاد کی بناء پر تھا جو فریقین کے سرداروں نے کیا تھا، اور فریقین میں سے ہر ایک کا مقصد اچھا تھا، اگرچہ اس اجتہاد میں برحق فریق ایک ہی ہے، اور وہ حضرت علیؓ اور ان کے رُفقاء ہیں، اور خطاء پر وہ حضرات ہیں جنھوں نے حضرت علیؓ سے نزاع و عداوت کا معاملہ کیا، البتہ جو فریق خطاء پر تھا، اسے بھی ایک اجر وثواب ملے گا، اس عقیدے میں صرف اہلِ جفاء و عناد ہی اختلاف کرتے ہیں، لہٰذا صحابہ کرامؓ کے درمیان مشاجرات کی جو صحیح روایات ہیں، ان کی بھی اس میں تشریح کرنا واجب ہے جو ان حضرات سے گناہوں کے الزام کو دُور کرنے والی ہو، لہٰذا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی وہ کسی کے لئے موجبِ عیب نہیں، نیز ابتداء میں حضرت علیؓ نے جو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، وہ دو باتوں میں سے کسی ایک وجہ سے تھی، یا تو اس لئے کہ ان سے مشورہ نہیں لیا گیا تھا، جیسا کہ خود انہوں نے اسی پر رنجیدگی کا اظہار فرمایا، یا پھر اس سے حضرت فاطمہؓ کی دِلداری مقصود تھی جو یہ سمجھتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث سے جو حصہ مجھے ملنا چاہیے وہ ملے، پھر حضرت علیؓ نے بلاشبہ تمام

لوگوں کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اللہ کے فضل سے مسلمانوں کی بات ایک ہوگئی اور مقصد حاصل ہوگیا۔

اسی طرح حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے میں جو توقف سے کام لیا وہ یا تو اس بناء پر تھا کہ یقینی طور پر قاتل معلوم نہ ہوسکا یا اس لئے کہ فتنہ و فساد میں اضافے کا خدشہ تھا، اور حضرت عائشہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم اور ان کے متبعین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں جنگ کرنے کو جو جائز سمجھا اس میں ان میں سے بعض حضرات مجتہد تھے اور بعض ان کی تقلید کرنے والے۔

اور اس بات پر اہلِ حق کا اتفاق ہے کہ ان جنگوں میں حق بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، اور وہ عقیدۂ برحق جس پر کوئی مصالحت نہیں ہوسکتی، یہ ہے کہ یہ تمام حضراتِ صحابہؓ عادل ہیں، اس لئے کہ ان تمام جنگوں میں انہوں نے تاویل اور اجتہاد سے کام لیا، اس لئے کہ اہلِ حق کے نزدیک اگرچہ حق ایک ہی ہوتا ہے، لیکن حق تک پہنچنے کے لئے پوری کوشش صَرف کرنے اور اس میں کوتاہی نہ کرنے کے بعد کسی سے غلطی بھی ہوجائے تو وہ ماجور ہی ہوتا ہے، گناہگار نہیں۔

اور درحقیقت ان جنگوں کا سبب معاملات کا اشتباہ تھا، یہ اشتباہ اتنا شدید تھا کہ صحابہؓ کی اجتہادی آراء مختلف ہوگئیں، اور وہ تین قسموں میں بٹ گئے، صحابہؓ کی ایک جماعت تو وہ تھی جس کے اجتہاد نے اسے اس نتیجے تک پہنچایا کہ حق فلاں فریق کے ساتھ ہے اور اس کا مخالف باغی ہے، لہٰذا اس پر اپنے اجتہاد کے

مطابق برحق فریق کی مدد کرنا اور باغی فریق سے لڑنا واجب ہے، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کا حال یہ ہو اس کے لئے ہرگز مناسب نہیں تھا کہ وہ امامِ عادل و برحق کی مدد اور باغیوں سے جنگ کے فریضے میں کوتاہی کرے۔ دُوسری قسم اس کے برعکس ہے اور اس پر بھی تمام وہی باتیں صادق آتی ہیں جو پہلی قسم کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ صحابہؓ کی ایک تیسری جماعت وہ تھی جس کے لئے کچھ فیصلہ کرنا مشکل تھا، اور ان پر یہ واضح نہ ہوسکا کہ فریقین میں سے کس کو ترجیح دے؟ یہ جماعت فریقین سے کنارہ کش رہی، اور ان حضرات کے حق میں یہ کنارہ کشی ہی واجب تھی، اس لئے کہ جب تک کوئی شرعی وجہ واضح نہ ہو، کسی مسلمان کے خلاف قتال کا اِقدام حلال نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تمام صحابہؓ معذور اور ماجور ہیں، گناہگار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اہلِ حق کے تمام قابلِ ذکر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ان کی شہادتیں بھی قبول ہیں اور ان کی روایات بھی، اور ان سب کے لئے عدالت ثابت ہے۔ اسی لئے ہمارے ملک کے علماء نے، اور ان کے علاوہ تمام اہلِ سنت نے، جن میں ابنِ حمدانؒ (نہایۃ المبتدئین) بھی داخل ہیں، فرمایا ہے کہ: تمام صحابہؓ سے محبت رکھنا اور ان کے درمیان جو واقعات پیش آئے ان کو لکھنے، پڑھنے، پڑھانے، سننے اور سنانے سے پرہیز کرنا واجب ہے، اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا، ان سے رضامندی کا اظہار کرنا، ان سے محبت رکھنا، ان پر اعتراضات کی رَوِش کو چھوڑنا، انہیں معذور سمجھنا، اور یہ یقین رکھنا واجب ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ

ایسے جائز اجتہاد کی بناء پر کیا جس سے نہ کفر لازم آتا ہے، نہ فسق ثابت ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات اس پر انہیں ثواب ہوگا اس لئے کہ یہ ان کا جائز اجتہاد تھا۔ پھر کہتے ہیں: بعض حضرات نے کہا ہے کہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، اور جس نے ان سے قتال کیا اس کی غلطی معاف کردی گئی ہے۔ اور الدرۃ المضیۃ کی نظم میں جو مشاجرات کے معاملے میں غور و بحث سے منع کیا گیا ہے، وہ اس لئے کہ امام احمد رحمہ اللہ اس شخص پر نکیر فرمایا کرتے تھے جو اس بحث میں اُلجھتا ہو، اور فضائلِ صحابہؓ میں جو احادیث آئی ہیں، انہیں تسلیم فرما کر ان لوگوں سے براءۃ کا اظہار کرتے تھے جو صحابہؓ کو گمراہ یا کافر کہتے ہیں، اور کہتے تھے کہ: (صحیح طریقہ) مشاجراتِ صحابہؓ میں سکوت اختیار کرنا ہے۔

یہ مختصر مجموعہ ہے سلف و خلف، متقدمین و متاخرین علمائے اُمت کے عقائد و اقوال کا جن میں تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عدل و ثقہ ہونے پر بھی اِجماع و اتفاق ہے اور اس پر بھی کہ ان کے درمیان پیش آنے والے مشاجرات میں خوض نہ کیا جائے یا سکوت اختیار کریں یا پھر ان کی شان میں کوئی ایسی بات کہنے سے پرہیز کریں جس سے ان میں سے کسی کی تنقیص ہوتی ہو۔

صحابہ کرامؓ معصوم نہیں، مگر مغفور و مقبول ہیں

اسی کے ساتھ ان سب حضرات کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ صحابہ کرامؓ، انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم نہیں، ان سے خطائیں اور گناہ سرزد ہوسکتے ہیں اور ہوئے ہیں، جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود اور سزائیں جاری فرمائی ہیں، احادیثِ نبویہ میں یہ سب واقعات ناقابلِ انکار ہیں۔ مذکورہ سابقہ بیانات میں اس کی

تصریحات موجود ہیں، ملاحظہ ہو روایت نمبر ۱۷، مگر اس کے باوجود عام افرادِ اُمت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بہ چند وجوہ خاص امتیاز حاصل ہے۔

۱:- اوّل یہ کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان کو ایسا بنادیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی، خلافِ شرع کوئی کام یا گناہ ان سے صادر ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا، ان کے اعمالِ صالحہ، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دینِ اسلام پر اپنی جانیں اور مال و اولاد سب کو قربان کرنا اور ہر کام پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضیات کے اِتباع کو وظیفۂ زندگی بنانا اور اس کے لئے ایسے مجاہدات کرنا جس کی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمالِ صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہوجانا اس کو خود ہی کالعدم کردیتا ہے۔

۲:- دُوسرے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور ادنیٰ گناہ کے صدور کے وقت ان کا خوف و خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا جاری کرنے کے لئے پیش کردینا اور اس پر اصرار کرنا، روایاتِ حدیث میں معروف و مشہور ہیں، بحکمِ حدیث توبہ کرلینے سے گناہ مٹادیا جاتا ہے اور ایسا ہوجاتا ہے کہ کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔

۳:- قرآنی ارشاد کے مطابق انسان کی حسنات بھی اس کی سیئات کا خود بخود کفارہ ہوجاتی ہیں:-

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ.

۴:- اقامتِ دین اور نصرتِ اسلام کے لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عسرت و تنگ دستی اور مشقت و محنت کے ساتھ ایسے معرکے سر کرنا کہ اقوامِ عالم میں ان کی نظیر نہیں۔

۵:- ان حضرات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان واسطہ

اور رابطہ ہونا، کہ باقی اُمت کو قرآن و حدیث اور دین کی تمام تعلیمات انہیں حضرات کے ذریعے پہنچی، ان میں خامی و کوتاہی رہتی تو قیامت تک دین کی حفاظت اور دُنیا کے گوشے گوشے میں اشاعت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کے اخلاق و عادات، ان کے حرکات و سکنات کو دین کے تابع بنادیا تھا، ان سے اوّل تو گناہ صادر ہی نہ ہوتا تھا، اور اگر عمر بھر میں کبھی شاذ و نادر کسی گناہ کا صدور ہوگیا تو فوراً اس کا کفارہ توبہ و اِستغفار اور دین کے معاملے میں پہلے سے زیادہ محنت و مشقت اُٹھا کر کردینا ان میں معروف و مشہور تھا۔

۶:- حق تعالیٰ نے ان کو اپنے نبیؐ کی صحبت کے لئے منتخب فرمایا اور دین کا واسطہ اور رابطہ بنایا تو ان کو یہ خصوصی اعزاز بھی عطا فرمایا کہ اسی دُنیا میں ان سب حضرات کی خطاؤں سے درگزر اور معافی اور اپنی رضاء و رضوان کا اعلان کردیا اور ان کے لئے جنت کا وعدہ قرآن میں نازل فرمادیا۔

۷:- نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو ہدایت فرمائی کہ ان سب حضرات سے محبت و عظمت علامتِ ایمان ہے، اور ان کی تنقیص و توہین خطرۂ ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا سبب ہے۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر ان کے معصوم نہ ہونے اور شاذ و نادر گناہ کے صدور کے باوجود ان کے متعلق اُمت کا یہ عقیدہ قرار پایا کہ ان کی طرف کسی عیب و گناہ کی نسبت نہ کریں، ان کی تنقیص و توہین کے شائبہ سے بھی گریز کریں، ان کے درمیان جو باہمی اختلافات اور مقاتلہ تک کی نوبت آئی ان مشاجرات میں اگرچہ ایک فریق خطاء پر، دُوسرا حق پر تھا، اور علمائے اُمت کے اِجماع نے ان مشاجرات میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کا حق پر ہونا اور ان کے بالمقابل جنگ کرنے والوں کا خطاء پر ہونا پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کردیا، لیکن ساتھ ہی قرآن و سنت کی نصوصِ مذکورہ کی بناء پر اس پر بھی سب کا اِجماع و اتفاق ہوا کہ جو فریق خطاء پر بھی تھا

اس کی خطاء بھی اوّلاً اجتہادی تھی جو گناہ نہیں، بلکہ اس پر ایک اَجر ملنے کا وعدہ حدیثِ صحیح میں مذکور ہے، اور اگر قتل وقتال اور جنگ کے ہنگاموں میں کسی سے واقعی کوئی لغزش اور گناہ ہوا بھی ہے تو وہ اس پر نادم وتائب ہوئے، جیسا کہ اکثر حضرات سے ایسے کلمات منقول ہیں (ان کا آگے ذکر کیا جائے گا)۔

خصوصاً جبکہ قرآنِ کریم نے ان کی مدح وثناء اور ان سے اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کا بھی اعلان فرمادیا، جو عفو ودرگزر سے بھی زیادہ اُونچا مقام ہے، ملاحظہ ہوں روایاتِ مذکورہ میں نمبر ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱۔

جن حضرات کے اتفاقی گناہوں اور خطاؤں کو بھی حق تعالیٰ معاف کرچکا تو اب کسی کو کیا حق ہے کہ ان گناہوں اور خطاؤں کا تذکرہ کرکے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرے اور اس مقدس گروہ پر اُمت کے اعتقاد واعتماد میں خلل ڈال کر دین کی بنیادوں پر ضرب لگائے، اس لئے سلف صالحین نے عموماً ان معاملات میں کفِ لسان اور سکوت کو ایمان کی سلامتی کا ذریعہ قرار دیا۔ باہمی حروب کے درمیان ہر فریق کے حضرات کی طرف جو باتیں قابلِ اعتراض منسوب کی گئیں، ان کے بارے میں وہ طریقہ اختیار کیا جو عقیدۂ واسطیہ کے حوالے سے اُوپر نقل کیا گیا ہے کہ ان قابلِ اعتراض باتوں کا بیشتر حصہ تو کذب وافتراء ہے جو روافض وخوارج اور منافقین کی روایتوں سے تاریخ میں درج ہوگیا ہے، اور جو کچھ صحیح بھی ہے تو وہ بھی گناہ اس لئے نہیں کہ اس کو انہوں نے اپنے اجتہاد سے جائز بلکہ دین کے لئے ضروری سمجھ کر اختیار کیا، اگرچہ وہ اجتہاد ان کا غلط ہی ہو مگر پھر بھی گناہ نہیں۔ اور اگر کسی خاص معاملے میں یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ خطاء اجتہادی ہی نہیں، واقعی گناہ کی بات ہے، تو ظاہر ان حضرات کے خوفِ خدا وفکرِ آخرت سے یہ ہے کہ انہوں نے اس سے توبہ کرلی، خواہ اس کا اعلان نہ ہوا ہو اور لوگوں کے علم میں نہ ہو، اور بالفرض یہ بھی نہ ہو تو ان کے حسنات اور دین کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ ان کی وجہ سے معافی ہوجانا قریب بہ یقین ہے۔

البتہ بعض حضرات نے روافض و خوارج اور منافقین کی شائع کردہ روایات سے عوام میں پھیلنے والی غلط فہمی دُور کرنے کے لئے مشاجراتِ صحابہؓ میں کلام کیا ہے، جو اپنی جگہ صحیح ہے، مگر پھر بھی وہ ایک مزلّۃ الاقدام ہے، جس سے صحیح سالم نکل آنا آسان کام نہیں ہے، اس لئے جمہور اُمت اور اتقیائے سلف نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

سلفِ صالحین اور علمائے اُمت کے ارشادات کا خلاصہ:-

ا:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بلا استثناء سب صحابہ کرامؓ کے حق میں فرمایا: وہ پاک دِل، عادات و اخلاق میں سب سے بہتر، اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے ہیں، ان کی قدر کرنا چاہئے (امام احمدؒ)۔

۲:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے جب حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ پر تین الزام لگائے گئے تو باوجودیکہ ان تین الزاموں میں ایک صحیح بھی تھا، مگر حضرت ابنِ عمرؓ نے مدافعت فرمائی اور الزام لگانے والوں کو ملزم ٹھہرایا (روایت نمبر ۱۹ ابنِ تیمیہؒ بعد صحیح)۔

۳:- افضل التابعین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بلا استثناء سب صحابہ کرامؓ کے متعلق فرمایا کہ: صحابہ کرامؓ اُمت کے سابقین اور ان کے مقتداء ہیں اور صراطِ مستقیم پر ہیں (ابوداؤد کتاب السنۃ، روایت نمبر ا)۔

۴:- حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے قتالِ صحابہؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ: یہ معاملہ ایسا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اس میں حاضر اور موجود تھے اور ہم غائب، وہ حالات و معاملات کی صحیح حقیقت جانتے تھے، ہم نہیں جانتے، اس لئے جس چیز پر وہ متفق ہوگئے ہم نے ان کا اِتباع کیا اور جس چیز میں ان کا اختلاف ہوا اس میں ہم نے توقف اور سکوت کیا (روایت نمبر ۱۴ از قرطبیؒ)۔

۵:- حضرت محاسبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حضرت حسن رحمہ اللہ نے فرمائی کہ ان حضراتِ صحابہؓ نے جو عمل اختیار کیا اس میں وہ

ہم سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، اس لئے ہمارا مسلک یہ ہے کہ جس معاملے میں ان کا اتفاق ہوتو ہم ان کا اِتباع کریں، اور جس میں اختلاف ہو وہاں توقف اور سکوت اختیار کریں، کوئی نئی رائے اپنی طرف سے قائم نہ کریں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے اجتہاد کی بناء پر کیا اور ان کا مقصود اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی تعمیل تھی، کیونکہ یہ حضرات دین کے معاملے میں متہم نہیں تھے (روایت نمبر۱۴ از قرطبیؒ)۔

۶:- حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے مشاجراتِ صحابہؓ میں گفتگو کرنے کے متعلق فرمایا کہ: یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا ہے (کیونکہ ہم اس وقت موجود نہ تھے)، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اپنی زبانوں کو بھی اس خون سے آلودہ نہ کریں (یعنی کسی صحابی پر حرف گیری نہ کریں اور کوئی الزام نہ لگائیں بلکہ سکوت اختیار کریں) (روایت نمبر۱۵ شرحِ مواقف)۔

۷:- امام مالکؒ کے سامنے جب ایک شخص نے بعض صحابہ کرامؓ کی تنقیص کی تو آپ نے قرآن کی آیت: "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" سے "لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ" تک تلاوت فرمائی اور کہا کہ: جس شخص کے دِل میں کسی صحابی کی طرف سے غیظ ہو وہ اس آیت کی زَد میں ہے، ذکرہ الخطیب أبوبکر۔ اور حضرت امام مالکؒ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا جو صحابہ کرامؓ کی تنقیص کرتے ہیں کہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کا اصل مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص ہے، مگر اس کی جرأت نہ ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی بُرائی کرنے لگے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ معاذ اللہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بُرے آدمی تھے، اگر وہ اچھے ہوتے تو ان کے صحابہؓ بھی صالحین ہوتے (الصارم المسلول ابنِ تیمیہؒ)۔

۸:- امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ صحابہ کرامؓ کی بُرائی کا تذکرہ کرے یا ان پر کسی عیب اور نقص کا طعن کرے، اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو اسے سزا دینا واجب ہے۔ اور فرمایا کہ: تم جس شخص کو

کسی صحابی کا بُرائی کے ساتھ ذکر کرتے دیکھو تو اس کے اسلام و ایمان کو متہم و مشکوک سمجھو (روایت نمبر۴)۔

اور ابراہیم بن میسرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو کبھی نہیں دیکھا کہ کسی کو خود مارا ہو، مگر ایک شخص جس نے حضرت معاویہؓ پر سب و شتم کی، اس کو انہوں نے خود کوڑے لگائے، (رواہ اللالکائی، ذکرہ ابن تیمیة فی الصارم المسلول)۔

۹:- امام ابوزرعہ عراقی رحمہ اللہ اُستاذِ مسلمؒ نے فرمایا کہ: تم جس شخص کو کسی صحابی کی تنقیص کرتے دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے جو قرآن و سنت سے اُمت کا اعتماد زائل کرنا چاہتا ہے، اس لئے اس کو زندیق اور گمراہ کہنا ہی حق و صحیح ہے (روایت نمبر۴)۔

یہ تو چند اسلافِ اُمت کے خصوصی ارشادات ہیں، اس کے علاوہ مذکور الصدر روایات و عبارات میں اس کو اُمت کا اجماعی عقیدہ بتلایا ہے جس سے انحراف کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

مشاجراتِ صحابہؓ کے معاملے میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کا عقیدہ اور فیصلہ ہے کہ خواہ اس وجہ سے کہ ہم ان پورے حالات سے واقف نہیں جن میں یہ حضراتِ صحابہؓ گزرے ہیں یا اس وجہ سے کہ قرآن و سنت میں ان کی مدح و ثناء اور رضوانِ خداوندی کی بشارت اس کو مقتضی ہے کہ ہم ان سب کو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے سمجھیں، اور ان سے کوئی لغزش بھی ہوئی ہے تو اس کو معاف قرار دے کر ان کے معاملے میں کوئی ایسا حرف زبان سے نہ نکالیں جس سے ان میں سے کسی کی تنقیص یا کسرِ شان ہوتی ہو، یا جو اُن کے لئے سببِ ایذاء ہوسکتی ہے، کیونکہ ان کی ایذاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء ہے۔ بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو اس معاملے میں محقق مفکر بہادری کا مظاہرہ کرے اور ان میں سے کسی کے ذمہ الزام ڈالے۔

مستشرقین اور ملحدین کے اعتراضات کا جواب

اس زمانے میں جن اہلِ قلم نے مصر اور ہند و پاکستان میں مشاجراتِ صحابہؓ کے مسئلے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اس پر کتابیں لکھی ہیں، ان کے پیشِ نظر دراصل آج کل کے مستشرقین اور ملحدین کا دفاع اور جواب دہی ہے، جس کو انہوں نے اسلام کی خدمت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔

اس وقت جبکہ عام مسلمانوں میں اپنی تعلیم کے فقدان اور نئی ملحدانہ تعلیم کے رواج نے خود مسلمانوں کے بہت بڑے طبقے کو اسلام اور عقائدِ اسلام اور احکامِ اسلام سے بیگانہ کردیا ہے، اسلاف کا ادب و احترام ان کے ذہنوں میں ایک بے معنی لفظ ہوکر رہ گیا ہے، اسی کا نام ''آزادیٔ خیال'' رکھا گیا ہے۔ مستشرقین اور ملحدین جو ہمیشہ سے اسلام پر مختلف جہات سے حملے کرنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، انہوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اسلام پر اس رُخ سے حملہ شروع کیا کہ عوام میں صحابہ کرامؓ کے متعلق ایسی باتیں پھیلائی جائیں جن سے صحابہ کرامؓ کا اعتماد و اعتقاد جو مسلمانوں کے دِلوں میں ہے وہ نہ رہے، اور جب اس مقدس گروہ سے اعتماد اُٹھ گیا تو پھر ہر بے دینی کے لئے راستہ ہموار ہوگیا، اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانوں ہی کی کتبِ تواریخ پر ریسرچ اور تحقیق کے نام سے کام شروع کیا، اور کتبِ تواریخ جو صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات پر مشتمل ہیں اور جن میں روافض و خوارج کی روایتیں بھی شامل ہیں ان میں سے چن چن کر وہ حکایات و روایات منظرِ عام پر لائے جن سے اس مقدس گروہ کی حیثیت اقتدار پسند لیڈروں سے زائد کچھ نہیں رہتی، اور ان میں بھی ان کی زندگی کو ایک گھناؤنی تصویر میں پیش کرنے لگے۔ ہمارا نوتعلیم یافتہ طبقہ جو

اپنے گھر کی چیزوں سے بے خبر اور اسلام کے ضروری عقائد و اَحکام سے ناواقف کر دیا گیا ہے، وہ مستشرقین کی کتابیں شوق سے پڑھتا ہے، اور یہ بدقسمتی سے ان کی بحثوں کو ہی ایک علم سمجھ کر پڑھتا ہے، وہ مستشرقین اور ملحدین کے اس دام میں آنے لگے۔

یہ دیکھ کر مسلمانوں میں سے کچھ اہلِ قلم نے ان کے دفاع کے لئے کام شروع کیا، اور یہ بلاشبہ اسلام کی ایک خدمت تھی جو زمانۂ قدیم سے علمِ کلام اور متکلمینِ اسلام کرتے آئے ہیں۔

لیکن اس کام کا جو طریقہ اختیار کیا وہ اُصولاً غلط تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود ان کے دام میں آگئے اور صحابہ کرامؓ کے تقدس اور پاک بازی کو مجروح اور اس مقدس گروہ کو بدنام کرنے کا جو کام مستشرقین اور ملحدین نہیں کر سکے تھے کہ حقیقت شناس مسلمان بہرحال ان کو دُشمنِ اسلام جان کر ان پر اعتماد نہ کرتے تھے، وہ کام ان مصنّفین کی کتابوں نے پورا کر دیا۔

وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شخصیت کو مجروح کرنے اور اس پر کوئی الزام ثابت کرنے کے لئے اسلام نے جرح و تعدیل کے خاص اُصول مقرّر فرمائے ہیں جو عقلی بھی ہیں اور شرعی بھی، جب تک الزامات کو جرح و تعدیل کے اس کانٹے میں نہ تولا جائے اس وقت تک کسی بھی شخصیت پر کوئی الزام عائد کرنا، اسلام میں جرم اور ظلم ہے۔ یہاں تک کہ جو شخصیتیں ظلم و جور میں معروف ہیں ان پر بھی کوئی خاص الزام بغیر ثبوت و تحقیق کے لگا دینے کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ بعض اکابرِ اُمت کے سامنے کسی نے حجاج بن یوسف ثقفی پر، جس کا ظلم و جور دُنیا میں معروف و متواتر ہے، کوئی تہمت لگائی تو اس بزرگ نے فرمایا کہ: تمہارے پاس اس کا ثبوتِ شرعی موجود ہے کہ حجاج بن یوسف نے یہ کام کیا ہے؟ ثبوت کوئی تھا نہیں، نقل کرنے والے نے حجاج کے بدنام اور معروف بالفسق ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ اس کا ثبوت مہیا کرے۔

اس مقدس بزرگ نے فرمایا کہ: خوب سمجھ لو کہ حجاج اگر ظالم ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے ہزاروں کشتگانِ ظلم کا انتقام لے گا تو اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ حجاج پر اگر کوئی غلط تہمت لگائے تو اس کا بھی انتقام اس سے لیا جائے گا، ربّ العالمین کا قانونِ عدل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص گناہگار فاسق بلکہ کافر بھی ہے تو اس پر جو چاہو الزام اور تہمت لگادو۔

اور جب اسلام کا یہ معاملہ عام افرادِ انسان یہاں تک کہ کفار و فجار کے ساتھ بھی ہے تو اندازہ لگایئے کہ جس گروہ یا جس فرد نے اللہ و رسولؐ پر ایمان لانے کے بعد اپنا سب کچھ ان کی مرضی کے لئے قربان کیا ہو اور اپنے ایک ایک قدم اور ایک ایک سانس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے اَحکام کی تعمیل کو وظیفۂ زندگی بنایا ہو، جن کے مقامِ اخلاق اور عدل و انصاف کی شہادتیں دُشمنوں نے بھی دی ہوں ان کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اس کو کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ ان کی مقدس ہستیوں کو بدنام کرنے اور ان پر الزامات لگانے کی لوگوں کو کھلی چھٹی دے دے کہ کیسی ہی غلط سلط روایت و حکایت سے بلاتنقید و تحقیق ان کو مجروح قرار دے دیا جائے۔

مستشرقین اور ملحدین تو دُشمنِ اسلام ہیں، یہ اگر جان بوجھ کر بھی اسلام کے اس عادلانہ اور حکیمانہ اُصولِ عدل و انصاف کو نظر انداز کریں تو ان سے کچھ مستبعد نہیں۔

مگر افسوس ان حضرات پر ہے جو ان کی مدافعت کے لئے اس خونیں میدان میں اُترے تھے، انہوں نے بھی اس اسلامی اُصول کو نظر انداز کر کے حضراتِ صحابہؓ کے بارے میں وہی طریقۂ کار اختیار کرلیا جس کو مستشرقین نے اپنی سوچی سمجھی تدبیر سے اسلام اور اسلافِ اسلام کے خلاف اختیار کیا تھا کہ صرف تاریخ کی بے سند اور خلط ملط روایات کو موضوعِ تحقیق اور مدارِ کار بناکر انہیں روایات و حکایات کی بنیاد پر حضراتِ صحابہؓ کی شخصیتوں پر الزامات عائد کردیئے۔

جبکہ یہ حضرات وہ ہیں کہ ان کی زندگی اور ان کے اَحوال کا بہت بڑا حصہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مقدسہ کا جزء ہے، اور علمِ حدیث میں بڑی احتیاط وتنقید کے ساتھ مدوّن ہو چکا ہے، اس طرح بہت بڑا حصہ خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے، کیونکہ بہت سی آیاتِ قرآن کا نزول خاص خاص صحابہ کرامؓ کے واقعات میں ہوا ہے، پھر قرآن میں جو حکم آیا اگرچہ وہ سب مسلمانوں کے لئے عام قرار پایا، مگر یہ صحابی تو خصوصیت سے اس کے مصداق تھے، اس طرح غور کیا جائے تو انہیں آیات کے ضمن میں صحابہ کرامؓ کے بہت سے حالات و معاملات آجاتے ہیں۔ جن حضرات کی زندگی کو سمجھنے اور ان کے حالات کو معلوم کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی محکم آیات اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں انتہائی احتیاط وتنقید وتحقیق کے ساتھ مدوّن کی ہوئی روایات موجود ہوں، اور ان کے بالمقابل فنِ تاریخ کی حکایات ہوں جن کے متعلق ائمۂ تاریخ کا اتفاق ہے کہ ان حکایات و روایات میں نہ صحتِ سند کا اہتمام ہے، نہ راویوں پر جرح وتعدیل کا محدثانہ دستور ہے، بلکہ ایک مورّخ کا دیانت دارانہ کام ہی اتنا ہے کہ کسی واقعے کے متعلق جتنی جس طرح کی روایات اس کو پہنچی ہیں وہ سب کو جمع کردے، خواہ وہ اس کے مسلک و مذہب کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ تاریخ کی صحیح وسقیم روایتیں اگر احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند و معتبر روایات کے خلاف کسی شخصیت کے بارے میں کوئی تاثر دیں اور ان پر کچھ الزامات عائد کریں، تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان مجروح، بے سند تاریخی روایات کو قرآن و حدیث کی شہادتوں پر ترجیح دے کر ان حضرات کو ملزم قرار دے دیا جائے۔

یہ صرف ''اسلامی عقیدت مندی'' اور ''صحابہؓ کی جنبہ داری'' کا مسئلہ نہیں بلکہ عقل و انصاف کا مسئلہ ہے، غیر مسلم مستشرقین اور ان کے ہم نواؤں سے میرا سوال ہے کہ ایک شخص یا جماعت کے متعلق اگر دو طرح کی روایات موجود ہوں، ایک قسم کی روایات میں روایت کی پوری سند محفوظ ہے، اس کے راویوں کو جرح وتعدیل کے معیار پر جانچا گیا ہے، الفاظِ روایت میں مکمل احتیاط برتی گئی ہے، اور دُوسری قسم ایسی

روایات کی ہیں جن میں تمام رطب و یابس، صحیح و غلط روایات بلا کسی سند کے آئی ہیں، اور کہیں کوئی سند ہے بھی تو اس کے راویوں کی کوئی جانچ پڑتال نہیں کی گئی، نہ روایت کے الفاظ ہی جانچ تول کر لئے گئے، ایسے حالات میں وہ ان دونوں قسم کی روایات میں سے کس قسم کو اپنی ریسرچ اور تحقیق میں ترجیح دیں گے۔

اگر عقل و انصاف آج بھی کسی چیز کا نام ہے تو ایک کام کر دیکھئے کہ مشاجراتِ صحابہؓ اور ان کی باہمی جنگوں میں جو حضرات پیش پیش ہیں، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، حضرت معاویہ، طلحہ و زبیر، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم وغیرہ، ان حضرات کے حالات اور ایک دُوسرے کے خلاف مقالات کچھ حدیث کی کتابوں میں بھی روایتِ حدیث کے اُصول پر پَرکھ کر جمع شدہ موجود ہیں، اور انہیں حضرات کے کچھ حالات و مقالات تاریخی روایات میں آئے ہیں، ان دونوں قسم کی روایات کو الگ الگ پڑھ کر اپنے دِلوں اور دِماغوں کا جائزہ لیں کہ علمِ حدیث میں آئی ہوئی روایات انہیں معاملات کے متعلق کیا تأثر دیتی ہیں؟ اور تاریخی روایات ان کے بالمقابل کیا تأثر چھوڑتی ہیں؟ ذرا سا تقابل کر کے دیکھیں تو کوئی شک نہیں رہے گا کہ حدیث میں جمع شدہ روایات سے اگر کسی صحابی کی کوئی زیادتی یا لغزش بھی معلوم ہوتی ہے تو اس کا مجموعی تأثر یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ان کی شخصیت مجروح، ناقابلِ اعتماد ہوجائے، بخلاف تاریخی روایات کے کہ ان کو پڑھ کر ایک انسان دونوں فریق کو یا کم از کم ایک فریق کو غلط کار، اقتدار پسند اور اقتدار ہی کے پیچھے جنگ لڑنے والا قرار دے گا۔ مستشرقین کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار و اختلاف پیدا کریں، صحابہ کرامؓ کے سب گروہ نہیں تو بعض ہی کو مجروح، غیر معتمد بنادیں، انہوں نے اگر قرآن و سنت کی نصوص و روایات سے آنکھیں بند کر کے صرف تاریخی روایات کی بناء پر حضراتِ صحابہؓ کے بارے میں کچھ فیصلے کئے تو کوئی بعید نہیں تھا، افسوس ان مسلم اہلِ قلم پر ہے جنھوں نے اس میدان میں قدم رکھنے کے ساتھ اسلام کے عادلانہ اُصولِ تنقید اور حکیمانہ جرح

وتعدیل کے اُصول کو نظر انداز کر کے انہیں تاریخی روایات کو مدارِ کار بنالیا۔ قرآن و حدیث کی نصوصِ صریحہ قطعیہ نے جن بزرگوں کی تعدیل نہایت وزن دار الفاظ میں فرمائی اور دین کے معاملے میں ان کے معتمد و معتبر ہونے کی گواہی دی، جن کے بارے میں قرآن وسنت ہی کی نصوص نے یہ بھی ثابت کردیا کہ ان سے کوئی گناہ یا لغزش ہوئی بھی ہے تو وہ اس پر قائم نہیں رہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغفور و مرحوم اور مقبول ہیں، اس کے بعد تاریخی روایات سے ان کو جرح و الزام کا نشانہ بنانا اسلام کے تو خلاف ہے ہی عقل و انصاف کے بھی خلاف ہے۔

اُمت کے اسلاف و اخلاف صحابہؓ وتابعینؒ اور بعد کے علمائے اُمت کا جو اِجماع اُوپر نقل کیا گیا ہے کہ مشاجراتِ صحابہؓ اور باہم ایک دُوسرے کے خلاف پیش آنے والے واقعات میں سکوت اور کفِ لسان ہی شیوۂ اسلاف ہے، اس معاملے میں جو روایات و حکایات منقول چلی آتی ہیں ان کا تذکرہ بھی مناسب نہیں۔

یہ کوئی ''اندھی عقیدت مندی'' یا ''تحقیق سے راہِ فرار'' نہیں، بلکہ صحیح تحقیق کا عادلانہ اور محتاط فیصلہ ہے۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہوچکا ہے کہ قرآن وسنت کی نصوصِ قطعیہ کی رُو سے یہ وہ مقدس گروہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور اُمت کے درمیان واسطہ بنانے کے لئے منتخب فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ کیمیاء اثر نے ان کے اعتقادات، اعمال، اخلاق و عادات میں وہ انقلابِ عظیم برپا کیا کہ باوجود غیر معصوم ہونے کے ان کا قدم شریعتِ اسلام کے خلاف نہ اُٹھتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دینِ اسلام کی نصرت میں ان کی خدمات حیرت انگیز ہیں، جن کو دُشمنانِ اسلام نے بھی حیرت کے ساتھ سراہا ہے، ان کی طرف جو قابلِ اعتراض بعض اعمال منسوب ہیں ان کا بہت بڑا حصہ تو وہ ہے جو سراسر جھوٹ و افتراء، سبائی تحریک کی سازش اور روافض وخوارج کی گھڑی ہوئی خرافات ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو بظاہر خلافِ شرع ہیں مگر حقیقۃً

خلافِ شرع نہیں بلکہ شرع پر عمل کرنے کی ایک خاص صورت ہے جس کو انہوں نے اپنے اجتہادِ شرعی سے تجویز اور دین کے لئے ضروری سمجھا، اگر اس میں ان سے خطاء بھی ہوئی ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ اس پر ان کو حسبِ تصریحِ حدیث ایک اَجر بھی ملے گا۔

اور اگر کوئی ایسا کام بھی کبھی کسی سے سرزد ہوا ہے جو خطاءِ اجتہادی نہیں بلکہ حقیقۃً گناہ ہے تو اوّلاً ایسا کام ان کی پوری اسلامی زندگی میں اتنا شاذ و نادر ہے کہ ان کے لاکھوں حسنات اور اسلام کی اہم خدمات کے مقابلے میں قابلِ ذکر بھی نہیں، پھر ان کے خوفِ خدا اور علم و بصیرت کے پیشِ نظر یہ ظاہر ہے کہ وہ اس پر قائم نہیں رہے بلکہ تائب ہوئے، اور یہ بھی نہ ہو تو شاذ و نادر خطاء و گناہ ان کی عظیم الشان اسلامی خدمات اور لاکھوں حسنات کی وجہ سے معاف ہوگیا، جس کی معافی کا اعلان حق تعالیٰ کی رضاء و رضوان کے عنوان سے قرآنِ کریم میں کردیا گیا ہے۔ ان حالات میں کیا عقل اور عدل و انصاف کا یہ تقاضا نہیں کہ تاریخی روایات کو منافقین و مخالفین کی روایات اور جھوٹی حکایات سے خالی بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ روایات بمقابلہ روایاتِ حدیث اور آیاتِ قرآن کے مجروح واجب الترک ہیں۔

عین جنگ کے وقت بھی صحابہ کرامؓ کی رعایتِ حدود

جماعتِ صحابہ کرامؓ وہ مقدس اور خداترس گروہ ہے جو اپنے جائز اعمال بلکہ طاعات و عبادات پر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور خائف رہتا ہے کہ جب اپنی کسی اجتہادی خطاء پر تنبہ ہوجاتا ہے تو ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف اور اس پر اِستغفار کرنا ان کا معمول ہے۔ مشاجراتِ صحابہؓ میں جو حضرات باجماعِ اُمت حق پر تھے اور حق کی مجبوری سے انہوں نے دُوسروں پر تلوار اُٹھائی اور فتح بھی پائی، وہ بھی نہ اپنی فتح پر مسرور ہوئے، نہ مفتوح حضرات کے مغلوب ہونے پر کوئی کلمۂ فخر ان کی زبانوں سے نکلا، بلکہ مقابل فریق کو بھی اللہ والا، نیک نیت مگر خطاءِ اجتہادی میں مبتلا سمجھ کر ان کے قتل اور نقصان پر افسوس و ندامت کا اظہار کیا۔ صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی

جماعت جو فریقین سے الگ غیر جانبدار رہی ان میں کسی کے ساتھ نہ رہی تھی، ان کو معذور قرار دیا بلکہ ان حضرات کی تحسین بھی کی گئی، مندرجہ ذیل روایات اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

۱:- حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ پر جو الزامات لگائے گئے تھے ان میں جس چیز کا خلافِ شرع ہونا ان کو ثابت ہوگیا اس سے توبہ کا اعلان کھلے طور پر فرمایا۔

(شرح عقیدۂ واسطیہ)

۲:- اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بصرہ کے سفر پر جہاں جنگِ جمل کا واقعہ پیش آیا، ندامت کا اظہار فرمایا، اور جب وہ اس واقعے کو یاد کرتی تھیں تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ تر ہوجاتا تھا۔ (شرح عقیدۂ واسطیہ)

۳:- حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے اس قصور پر ندامت کا اظہار فرماتے تھے کہ ان سے حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے میں کوتاہی ہوئی۔ (ایضاً)

۴:- حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس سفر پر ندامت کا اظہار کیا جس میں جنگِ جمل کا حادثہ پیش آیا۔ (ایضاً)

۵:- حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے (اس قتال میں حق پر ہونے کے باوجود) بہت سے پیش آنے والے واقعات پر ندامت کا اظہار فرمایا۔ (ایضاً)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ، حضرت اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے موقع پر آپؓ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ مخالف لشکر والوں کے حق میں غلوآمیز باتیں کہہ رہا ہے، آپؓ نے فرمایا: ان کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو، ان لوگوں نے سمجھا ہے کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، اس لئے ہم ان سے قتال کر رہے ہیں۔ (منہاج السنۃ ج:۳ ص:۶۱)

نیز ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ جنگِ جمل اور جنگِ

صفین میں قتل ہونے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت علیؓ نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

لا یموتن أحد من هؤلاء وقلبهٔ نقیّ اِلّا دخل الجنة.

(مقدمہ ابنِ خلدون ص:۳۸۵ فصل نمبر:۳۰)

ترجمہ:- ان میں سے جو شخص بھی صفائی قلب کے ساتھ مرا ہوگا، وہ جنت میں جائے گا۔

اور جنگِ صفین کے دوران راتوں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ: اچھا مقام وہ تھا جو عبداللہ بن عمرؓ اور سعد بن مالکؓ نے اختیار کیا کہ اس جنگ سے علیحدہ رہے، کیونکہ یہ کام اگر انہوں نے صحیح کیا، تب تو ان کے اَجرِ عظیم میں کیا شبہ ہے؟ اور اگر اس جنگ سے علیحدہ رہنا کوئی گناہ بھی تھا تو اس کا معاملہ بہت ہلکا ہے۔ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے:-

یا حسن! یا حسن! ما ظنّ أبوک ان الأمر یبلغ الیٰ هٰذا
ودّ أبوک لو مات قبل هٰذا بعشرین سنة.

یعنی اے حسن! اے حسن! تیرے باپ کو یہ گمان کبھی نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا، تیرے باپ کی تمنا یہ ہے کہ کاش! وہ اس واقعے سے بیس سال پہلے فوت ہوگیا ہوتا۔

اور جنگِ صفین سے واپسی کے بعد لوگوں سے فرماتے تھے کہ: امارتِ معاویہؓ کو بھی بُرا نہ سمجھو، کیونکہ وہ جس وقت نہ ہوں گے تو تم سروں کو گردنوں سے اُڑتے ہوئے دیکھو گے۔ (شرح عقیدۂ واسطیہ ص:۴۵۸، ۴۵۹)

معجمِ طبرانی کبیر میں طلحہ بن مصرف سے روایت ہے کہ جب واقعۂ جمل میں حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہوگئے، حضرت علیؓ اپنے گھوڑے سے اُترے اور ان کو اُٹھایا اور ان کے چہرے سے

غبار صاف کرنے لگے اور رو پڑے اور کہنے لگے کہ: کاش! میں اس واقعے سے بیس سال پہلے مرگیا ہوتا۔ (از جمع الفوائد ج:۲ ص:۲۱۴)

سننِ بیہقی میں ان کی سند کے ساتھ یہ روایت ہے کہ جنگِ جمل میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے مقابلے پر قتال کرنے والے حضرات کے بارے میں حضرت علیؓ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ لوگ مشرک ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: شرک سے بھاگ کر ہی تو وہ اسلام میں آئے ہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں؟ تو فرمایا:-

ان المنافقین لا یذکرون اللہ الّا قلیلًا.

یعنی منافقین تو اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں (اور یہ لوگ تو بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے ہیں)۔

پھر پوچھا گیا کہ پھر یہ کیا ہیں؟ تو فرمایا: ہمارے بھائی ہیں، جنھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ (سننِ بیہقی ج:۸ ص:۱۷۲ طبع دائرۃ المعارف دکن)

اور اسی سننِ بیہقی میں حضرت ربعی بن خراش رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا:-

انی لأرجوا أن أکون وطلحة وزبیر ممن قال اللہ عزّ وجلّ: وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ.

(سننِ بیہقی ج:۸ ص:۱۷۳)

ترجمہ:- مجھے اُمید ہے کہ قیامت کے روز میں اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ: (جنت میں) ان کے دِلوں کی باہمی کدورتیں نکال دیں گے۔

۶:- اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے قسم کھا کر فرمایا کہ: علیؓ مجھ سے بہتر اور مجھ سے افضل ہیں، اور میرا ان سے اختلاف صرف

حضرت عثمانؓ کے قصاص کے مسئلے میں ہے، اور اگر وہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہلِ شام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا سب سے پہلے میں ہوں گا۔

(البدایۃ والنہایۃ ج:۷ ص:۱۲۹ و ص:۲۵۹)

۷:- جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو وہ رونے لگے، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ زندگی میں ان سے لڑتے رہے، اب روتے ہیں؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نہیں جانتیں کہ ان کی وفات سے کیا فقہ اور کیسا علم دُنیا سے رُخصت ہوگیا۔ (البدایۃ والنہایۃ ج:۸ ص:۱۲۹)

۸:- ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ضرار صدائی سے کہا کہ: میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو۔ اس پر انہوں نے غیر معمولی الفاظ میں حضرت علیؓ کی تعریف کی، حضرت معاویہؓ نے فرمایا: اللہ، ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم! وہ ایسے ہی تھے۔ (الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۴۳، ۴۴)

۹:- قیصرِ رُوم نے مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھاکر ان پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے قیصر کے نام ایک خط میں لکھا:-

> اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کرلوں گا، پھر تمہارے خلاف ان کا جو لشکر روانہ ہوگا اس کے ہراوّل دستے میں شامل ہوکر قسطنطنیہ کو جلاکر کوئلہ بنا دُوں گا، اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح اُکھاڑ پھینکوں گا۔
>
> (تاج العروس ج:۷ ص:۲۰۸ مادۃ: اصطفلین)

۱۰:- متعدّد مؤرّخین نے نقل کیا ہے کہ جنگِ صفین وغیرہ کے موقع پر دن کے وقت فریقین میں جنگ ہوتی اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دُوسرے لشکر میں جاکر ان کے مقتولین کی تجہیز وتکفین میں حصہ لیا کرتے تھے۔

(البدایۃ والنہایۃ ج:۷ ص:۲۲۷)

خلاصہ یہ ہے کہ جتنے حضراتِ صحابہؓ اس باہمی قتال میں وجوہِ شرعیہ کی بناء پر پیش پیش تھے اور ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر مقابل سے لڑنے پر مجبور تھا، انہوں نے عین قتال کے وقت بھی حدودِ شرعیہ سے تجاوز نہیں کیا، اور فتنہ فرو ہونے کے بعد ایک دُوسرے کے متعلق ان کی رَوِش بدل گئی اور جو کچھ نقصان دُوسرے فریق کے لوگوں کو ان کے ہاتھ سے پہنچا، باوجودیکہ وہ شرعی وجوہ کی بناء پر تھا، پھر بھی اس پر ندامت وافسوس کا اظہار کیا۔

اللہ تعالیٰ کو ان واقعات کے پیش آنے سے پہلے اس مقدس گروہ کے قلوب اور ان کے اِخلاص للہ کا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم وتائب ہونے کا حال معلوم تھا، اس لئے پہلے ہی یہ سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے ان سب سے راضی ہونے کا اور ان کے ابدی جنتی ہونے کا اعلان قرآن میں نازل فرمادیا تھا، جو درحقیقت اس کا اعلان ہے کہ اگر ان میں سے کسی سے کوئی واقعی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو وہ اس پر قائم نہیں رہے تائب ہوگئے اور ان کے نامۂ اعمال سے اس کو محو کردیا گیا۔ کس قدر حیرت ہے کہ ''اسلام کی خدمت'' کا نام لینے والے بعض حضرات ان سب چیزوں سے آنکھیں بند کرکے مستشرقین وملحدین کے طریقے پر چل پڑے، ان حضرات کی شخصیات وذات پر تاریخ کی غلط سلط اور خلط ملط روایات سے الزامات تراشنے لگے؛ جن کو خدا تعالیٰ نے معاف کردیا، انہوں نے ان کو معاف نہیں کیا، جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے راضی ہونے کا اعلان کردیا، یہ ان سے راضی نہیں ہوئے۔

اور جب ان سے کہا گیا تو جواب میں یہ کافی سمجھ لیا کہ ہم نے تو ایسے ثقہ اور مستند علماء اور محدثین کی کتبِ تاریخ سے نقل کیا ہے جن کے ثقہ اور معتمد علیہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں، اور یہ نہ سوچا کہ ان حضرات نے فنِ تاریخ کو فنِ حدیث سے الگ کیوں کیا، ان کا کلام فنِ حدیث میں جس معیارِ تنقید و تحقیق پر ہوتا ہے فنِ تاریخ میں وہ معیار نہیں ہوتا، اس میں نہ سند مکمل ہونے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، نہ راویوں پر جرح وتعدیل کی، ان کی نظر میں خود یہ تاریخی روایات کا ذخیرہ اس کام کے لئے نہیں کہ ان سے کوئی عقیدے کا مسئلہ ثابت کیا جائے یا کسی کی ذات و شخصیت کو ان کی بناء پر بلاتحقیق مجروح قرار دے دیا جائے۔ صحابہ کرامؓ کا معاملہ تو بہت بالا و بلند ہے، عام مسلمانوں میں سے بھی کسی کو ان تاریخی روایات کی بناء پر بلاتحقیق کے مجروح، قابلِ سزا یا فاسق کہنے کی یا ایسے انداز میں پیش کرنے کی اجازت کسی کے نزدیک نہیں دی جاسکتی جس سے پڑھنے والے ان کو اقتدار پرست اور شریعت کے جائز و ناجائز سے بے فکر قرار دے۔

تنبیہ

یہ بات مقدمۂ کتاب میں وضاحت سے لکھی جاچکی ہے کہ اس سے ہرگز لازم نہیں آتا کہ فنِ تاریخ کسی معاملے میں قابلِ اعتماد نہیں، وہ فضول و بیکار ہے۔ علمائے اسلام نے اس فن کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اس کی اسلامی اہمیت کی شاہد ہیں، اور مسلمان ہی درحقیقت اس فن کو باقاعدہ فن بنانے والے ہیں، مگر ہر فن کا ایک مقام اور درجہ ہوتا ہے، فنِ تاریخ کا یہ درجہ نہیں کہ صحابہ کرامؓ کی ذوات و شخصیات کو قرآن و سنت کی نصوص سے صَرفِ نظر کرکے صرف تاریخی روایات کے آئینے میں دیکھا جائے اور اس پر عقیدے کی بنیاد رکھی جائے۔ جس طرح فنِ طب کی کتابوں سے اشیاء کے حلال و حرام یا پاک و ناپاک ہونے کے مسائل و اَحکام ثابت نہیں کیے جاسکتے، اگرچہ طب کی یہ کتابیں اکابر علماء ہی کی تصنیف ہوں۔

مشاجراتِ صحابہؓ اور کتبِ تاریخ

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ عام واقعات و معاملات میں تاریخی روایات پر جتنا اعتماد کیا جاسکتا ہے، مشاجراتِ صحابہؓ کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں ان تاریخی روایات کے اعتماد کا وہ درجہ بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل تو مشاجرات جس حدِ قتل و قتال تک پہنچے ان میں بنیادی طور پر منافقین کی سبائی تحریک کا ہاتھ تھا جن کی اسلام دُشمنی کھلی ہوئی ہے، پھر اسی تحریک کے نتیجے میں خود عہدِ صحابہؓ ہی کے اندر روافض و خوارج دو فرقے پیدا ہوگئے تھے، جو بعض صحابہؓ سے عداوت رکھتے تھے، اور اس زمانے میں جیسے منافقین مسلمانوں کے ہر طبقہ، کام میں اسلامی شکل و صورت اور اسلامی رفتار و گفتار کے ساتھ شریک رہتے تھے اسی طرح یہ صحابہ کرامؓ کے مخالف گروہ بھی اس وقت آج کی طرح کسی ممتاز فرقے کی حیثیت میں نہ تھے کہ ان کی کتابیں حدیث و فقہ کی الگ ممتاز ہیں، ان کے سارے کام اہلِ سنت والجماعت سے الگ ہیں، اُس وقت یہ صورت نہ تھی جس سے عام مسلمان متنبہ ہوسکتے، یہ سب کے سب مسلمانوں کی ہر جماعت، ہر طبقے میں ملے جلے تھے، بہت سے مسلمان بھی اپنے حسنِ ظن اور ان کے عدمِ امتیاز کی وجہ سے ان کی باتوں اور روایتوں پر اعتماد کرلیتے تھے، خود قرآنِ کریم نے ایک تفسیر کے مطابق بعض مسلمانوں کا منافقین کی باتوں سے متاثر ہونے کی تصریح فرمائی: ”وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ“ سَمَّاعُونَ کے معنی جاسوس کے ہیں۔ اس طرح منافقین اور روافض و خوارج کی گھڑی ہوئی روایتیں بہت سے ثقہ اور معتمد علیہ مسلمانوں کی زبانوں پر بھی اعتماد کے ساتھ جاری تھیں۔ یہ معاملہ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو تھا نہیں کہ اس میں روایات قبول کرنے میں کڑی احتیاط اور تیقظ کا مظاہرہ کیا جاتا، فتنوں اور ہنگاموں کے حالات اور ان میں مشہور ہونے والی روایات کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ شہر میں کسی جگہ کوئی

ہنگامہ پیش آجائے تو اسی زمانے اور اسی شہر کے رہنے والے بڑے بڑے ثقہ لوگوں کی روایتوں کا بھروسہ نہیں رہتا، کیونکہ جس شخص سے انہوں نے سنا تھا اس کو ثقہ و معتمد سمجھ کر اس کی روایت بیان کردی، مگر ہوتا یہ ہے کہ اس معتمد نے بھی خود واقعہ دیکھا نہیں، کسی دُوسرے سے سنا اور یوں روایت در روایت ہوکر ایک بالکل بے سروپا افواہ ایک معتمد علیہ روایت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

مشاجراتِ صحابہؓ کا معاملہ اس سے الگ کیسے ہوجاتا؟ جبکہ اس میں سبائی تحریک کے نمائندوں اور روافض و خوارج کی سازشوں کا بڑا دخل تھا۔ اس لئے اسلامی تواریخ جن کو اکابر علماء محدثین اور دُوسرے ثقہ و معتبر حضرات نے جمع فرمایا اور اُصولِ تاریخ کے مطابق ہر طرح کی روایات جو کسی واقعے سے متعلق ان کو پہنچی تاریخی دیانت کے اُصول پر سب کو بے کم و کاست درج کردیا۔

تو اَب سمجھ لیجئے کہ روایات کا مجموعہ کس درجہ قابلِ اعتبار ہوسکتا ہے؟ عام دُنیا کے واقعات و حالات میں جو تاریخی روایات جمع کی جاتی ہیں ان میں اس طرح کے خطرات عموماً نہیں ہوتے، اس لئے کتبِ تواریخ کا وہ حصہ جو مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق ہے خواہ اس کے لکھنے والے کتنے بڑے ثقہ اور معتمد علماء ہوں ان کے اعتبار کا وہ درجہ بھی ہرگز باقی نہیں رہتا جو عام تاریخی واقعات کا ہوتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ان معاملات میں جو کچھ فرمایا، اگر غور کرو تو اس کے سوا کوئی دُوسری بات کہنے اور سننے کے قابل نہیں، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ ارشاد پہلے روایت نمبر۱۴ میں بحوالہ تفسیرِ قرطبی گزر چکا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

وقد سئل الحسن البصری رحمه الله عن قتالهم، فقال:
قتال شهده أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم وغبنا،
وعلموا وجهلنا، واجتمعوا فاتبعنا، واختلفوا فوقفنا.

قال المحاسبي فنحن نقول كما قال الحسن ونعلم ان القوم كانوا أعلم بما دخلوا فيه منا ونتبع ما اجتمعوا عليه ونقف عندما اختلفوا ولا نبتدع رأيًا منّا ونعلم أنهم اجتهدوا وأرادوا الله عزّ وجلّ اذ كانوا غير متهمين في الدين ونسأل الله العافية.

(تفسیرِ قرطبی سورۂ حجرات ج:۱۶ ص:۳۲۲)

ترجمہ:- حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے قتالِ صحابہؓ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: اس قتال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ حاضر تھے اور ہم غائب، وہ لوگ حالات و واقعات اور اس وقت کی مقتضیاتِ شرعیہ سے واقف تھے، ہم ناواقف، اس لئے جس چیز پر ان کا اتفاق ہوا اس میں ہم نے ان کی پیروی کی، اور جس چیز میں ان کا اختلاف ہوا اس میں ہم نے توقف اور سکوت اختیار کیا۔

حضرت محاسبی رحمہ اللہ اس قول کو نقل کر کے حضرت حسنؒ کے قول کو اختیار کرتے ہیں، اور آخر میں فرماتے ہیں کہ: ہم پوری طرح جانتے ہیں کہ ان حضرات نے اجتہاد کیا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کے طالب تھے، کیونکہ دین کے معاملے یہ لوگ متہم نہیں تھے۔

❁❁❁

یہ عقل و انصاف کا فیصلہ ہے
یا تحقیقِ حق سے فرار؟

غور فرمایئے کہ ہنگامی حالات اور منافقین و روافض و خوارج کی روایات کے شیوع نے روایات میں جو تلبیس اور شبہات پیدا کر دیئے تھے ایسے حالات میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے جو فیصلہ فرمایا وہ عقلِ سلیم اور عین عدل و انصاف کا فیصلہ ہے یا اندھی عقیدت مندی اور تحقیقِ حق سے فرار؟ نعوذ باللہ منہ۔

یہاں غور طلب یہ ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جو اجلہ تابعین میں سے صحابہ کرامؓ کو دیکھنے والے ہیں، وہ صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات میں پیش آنے والے ہنگاموں کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ "ہمیں ان کے حالات معلوم نہیں" جس کا حاصل یہی ہوسکتا ہے کہ حالات کا ایسا علم یقینی شرعی اُصول کے مطابق نہیں ہے جس کی بناء پر کسی شخصیت پر کوئی الزام لگایا جاسکے۔

تو بعد کے آنے والے مؤرخین خواہ وہ ائمۂ حدیث بھی ہوں، جیسے ابنِ جریرؒ، ابنِ اثیرؒ وغیرہ ان کو صدیوں کے بعد ان حالات کا علم اس پیمانے پر کیسے ہوسکتا تھا جن پر کسی عقیدے یا عمل کی بنیاد رکھی جاسکے، اور نہ انہوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے، بلکہ فنِ تاریخ کا جو چلا ہوا دستور ہر طرح کی موافق مخالف، صحیح سقیم روایات جمع کر دینا ہے، اس کے مطابق انہوں نے اپنی تاریخ میں ہر طرح کی روایات جمع کی ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ فیصلہ تو ایسا ہے کہ اس میں کسی عقیدے اور مذہب کا دخل نہیں، کوئی غیر مسلم بھی اگر انصاف پسند ہو تو اس کو بھی روایاتِ تاریخی کے التباس و تضاد کے عالم میں اس کے سوا کسی فیصلے کی گنجائش نہیں کہ بے خبری اور ضروری قابلِ اعتماد معلومات نہ ہونے کی بناء پر سکوت کو اَسلم قرار دے۔

اور جن حضراتِ علماء نے قرآن وسنت کی نصوص کی بناء پر یہ قرار دیا کہ ان میں سے جس کسی پر کوئی واقعی الزام کسی گناہ وخطاء کا ثابت بھی ہو جائے تو انجامِ کار وہ اس گناہ وخطاء سے بھی عنداللہ بَری ہو چکے ہیں، اس لئے اب کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان کے ایسے اعمال کو مشغلۂ بحث بنائے، اس کا مستشرقین انکار کریں تو کر سکتے ہیں کہ ان کا قرآن و رسولؐ پر ایمان ہی نہیں، وہ ان کے ارشادات کو بھی غلط بتلاتے ہیں، ان کی بناء پر کسی کی توثیق و تعدیل کیسے کریں؟ مگر کسی مسلمان کے لئے تو ان کی مدافعت میں بھی اس کی گنجائش نہیں کہ ان کے اس کفر و انکار کو تسلیم کر کے اس بحث میں اُلجھ جائے جس کا جال مستشرقین نے اسی لئے پھیلایا ہے کہ قرآن وسنت سے ناواقف یا بے فکر مسلمان اس میں اُلجھ کر اپنے صحابہ کرامؓ کے مقدس گروہ کا اعتماد کھو بیٹھیں۔ ایسے لوگوں کی مدافعت بھی کرنا ہے تو اس کا محاذ یہ نہیں کہ جہاں وہ مسلمانوں کو کھینچ کر لانا چاہتے ہیں بلکہ ان کی جنگ کا محاذ یہ ہے کہ ان سے قرآن و رسولؐ کی حقانیت اور صدق پر کلام کیا جائے، جو اس کو نہیں مانتا اس سے مسلمانوں کے کسی گروہ و جماعت کا تقدس منوانے کا کیا راستہ ہے؟ ایسے حالات میں تو مسلمانوں کی راہِ عمل قرآن نے بتلادی ہے کہ: "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" یعنی تمہارے لئے تمہارا دین ہے، ہمارے لئے ہمارا، کہہ کر اپنے ایمان کی حفاظت اور اس کو مضبوط کرنے کی فکر میں لگ جائیں، مسلمانوں کو قرآن وسنت کی نصوص سے مطمئن کریں اور غیروں کے اعتراضات کی فکر چھوڑ دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور علمائے اُمت نے جو مشاجراتِ صحابہؓ میں کفِ لسان اور سکوت کو اَسلم قرار دیا، اور اس میں بحث و مباحثہ کو خطرۂ ایمان بتلایا، یہ کورانہ عقیدت مندی کا نتیجہ نہیں بلکہ عقلِ سلیم اور عدل و انصاف کا فیصلہ ہے۔

جن حضرات نے اس زمانے میں پھر ان مشاجراتِ صحابہؓ کو موضوعِ بحث بنا کر کتابیں لکھی ہیں، اگر واقعی ان کا مقصد اس سے ملحدین و مستشرقین کا جواب اور

مدافعت ہے تو ان کا فرض ہے کہ یا تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے طریق پر ان کو ان کی اس گمراہی پر متنبہ کریں کہ اعمال و اخلاق اور کردار و عمل کے اعتبار سے جن انسانی ہستیوں کو دوست دشمن، موافق مخالف سب نے بڑی حیثیت دی ہے، ان کو بے اعتبار اور مجروح کرنے کے لئے جو ہتھیار تم استعمال کر رہے ہو وہ ہتھیار کند و ناکارہ ہیں، تاریخ کی بے سند، بے تحقیق روایات سے کسی بھی شخصیت کو ملزم نہیں قرار دیا جاسکتا جب تک وہ تواتر کی حد کو نہ پہنچ جائے۔

یا پھر ان کو یہ بتلادینا چاہئے کہ ہم بحمداللہ مسلمان ہیں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، جن شخصیتوں کی تعدیل و توثیق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کردی اس کے خلاف اگر کوئی بھی روایت ہمارے سامنے آئے گی، ہم اس کو بمقابلہ قرآن و سنت کی نصوص کے جھوٹ و افتراء یا کم از کم مرجوح اور مجروح قرار دیں گے۔

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ.

ان دو طریقوں کے سوا کوئی تیسرا طریقہ مستشرقین و ملحدین کی مدافعت کا نہیں ہوسکتا، اور اگر خدانخواستہ اس بحث سے مقصود مدافعت نہیں محض "تحقیق و ریسرچ" کا شوق پورا کرنا ہے، تو یہ نہ اپنے ایمان کے لئے کوئی اچھا عمل ہے، نہ مسلمانوں کے لئے کوئی اچھی خدمت۔

دردمندانہ گزارش

میں اس وقت اپنی عمر کے آخری ایام، مختلف قسم کے امراض اور روز افزوں ضعف کی حالت میں گزار رہا ہوں، زندگی سے دُور، موت سے قریب ہوں، یہ وہ وقت ہے جس میں فاسق و فاجر بھی توبہ کی طرف لوٹتا ہے، جھوٹا آدمی سچ بولنے لگتا ہے، ضدی آدمی اپنی ضد چھوڑ دیتا ہے۔

گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا
ان تک اب نالۂ سحر جائے
دِلِ مجروح کی صدا ہے یہ
کاش! دِل میں ترے اُتر جائے

اس وقت کسی تصنیف و تالیف کے شوق نے مجھے یہ صفحات نہیں لکھوائے، بلکہ اُمتِ مسلمہ کا وہ سویا ہوا فتنہ جس نے اپنے وقت میں ہزاروں لاکھوں کو گمراہ کر دیا تھا، اس وقت ملحدین اور مستشرقین کی گہری چال سے اس کو پھر بیدار کر کے مسلمانوں کو تباہ کرنے والے بہت سے فتنوں میں سے ایک اور نئے فتنے کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ملحدین و مستشرقین کی شرارتوں اور اسلام دُشمنی سے ہمارے عوام اور نوتعلیم یافتہ حضرات نہ سہی، مگر علم و بصیرت رکھنے والے مسلمان تو کم از کم واقف ہیں، ان کی باتوں سے اتنے متاثر نہیں ہوئے، مگر ہمارے ہی مسلمان اہلِ قلم حضرات کی ان کتابوں نے وہ کام پورا کر دیا جو مستشرقین نہ کر سکتے تھے کہ خود لکھے پڑھے اہلِ علم اور پختہ ایمان مسلمانوں کے ذہنوں کو صحابہ کرامؓ کے بارے میں متزلزل کر دیا اور حدودِ مذہب و دین سے آزاد، علومِ قرآن و سنت سے بے خبر نوتعلیم یافتہ نوجوانوں میں تو ان حضرات پر اس طرح طعن و تشنیع اور جرح و تنقید ہونے لگی جیسے موجودہ زمانے کے اقتدار پرست لیڈروں پر ہوتی ہے۔

اور یہ گمراہی کا وہ درجہ ہے کہ اس کے بعد قرآن و سنت، توحید و رسالت اور اُصولِ دین بھی مجروح و ناقابلِ اعتبار ہو جاتے ہیں۔

اس لئے عام مسلمانوں کی اور اپنے نوخیز تعلیم یافتہ طبقے کی اور خود ان حضراتِ مصنّفین کی خیر خواہی اور نصیحت کے جذبے سے یہ صفحات سیاہ کئے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ ان میں اثر دے اور یہ حضرات میری گزارشات کو خالی الذہن ہو کر پڑھ لیں، جواب دہی کی فکر نہ کریں، اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں

کہ نجاتِ آخرت کا راستہ جمہور اُمت کی راہ سے الگ نہیں ہوسکتا۔ جس معاملے میں ان حضرات نے سکوت اور کفِ لسان کو اختیار کیا وہ کسی بزدلی یا خوفِ مخالفت سے نہیں بلکہ عقلِ سلیم اور اُصولِ دین کے مطابق سمجھ کر اختیار کیا، ان کے طریق سے الگ ہوکر محققانہ بہادری دِکھانا کوئی اچھا کام نہیں ہوسکتا۔ اگر اپنی کوئی غلطی واضح ہوجائے تو آئندہ اس سے بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کا اہتمام کریں اور جتنا ہوسکے سابقہ غلطی کا تدارک کریں۔ یہ بحثیں اور سوال و جواب کی طمطراق بہت جلد ختم ہوجانے والی ہے، اور اس کا ثواب یا عذاب باقی رہنے والا ہے، مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؎

نہ بہ نقش بستہ مشوشم نہ بہ حرف ساختہ سرخوشم

نفسے بیاد تو می زنم چہ عبارت و چہ معانیم

آخر میں اپنے لئے اور سب اہلِ علم بھائیوں کے لئے اس دُعا پر ختم کرتا ہوں:-

اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ.

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَصَفْوَةِ رُسُلِهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى أَصْحَابِهٖ خِيَارُ الْخَلَائِقِ بَعْدَ الْأَنْبِيَاءِ وَنَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يَّرْزُقَنَا حُبَّهُمْ وَعَظَمَتَهُمْ وَيُعِيْذَنَا مِنَ الْوُقُوْعِ فِيْ شَيْءٍ يشينهم وَأَنْ يَّحْشُرَنَا فِيْ زُمْرَتِهِمْ.

قد أخذت في تسويده لغرة ربيع الأوّل ١٣٩١هـ فجاء بعون الله سبحانه وحمده في أحد عشر يوما كما تراه، والله سبحانه وتعالىٰ أسئل أن يتقبله.

بندہ ضعیف و ناکارہ

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

خادم دار العلوم کراچی

یوم الجمعہ ۱۱؍ ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ